ٹھنڈی عورت



نیلما ناہید درانی

فہرست



یادیں اور برساتیں

بارش رکتے ہی لوگ برساتی کیڑوں کی طرح سڑکوں پر نکل آئے۔ مئی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اور گرمی کے بعد یہ ساون کی پہلی بارش تھی۔ جو صبح سے مسلسل ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا کے تمام کاروبار بند ہو چکے ہیں۔ سڑکیں سنسان تھیں پانی سے بھری ہوئی گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے نہاتے شور مچاتے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ مگر اب بارش رکتے ہی لوگ گھروں دفتروں اور سائبانوں سے نکل کر سڑکوں پر چل پڑے تھے۔ دیبا نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

کیمپس کے تمام ہوسٹلوں کی عمارتیں دھلی دھلائی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ بکھرا ہوا تھا۔ نہر کنارے صاف شفاف ہرے بھرے درخت ایستادہ تھے رنگ برنگ لباس پہنے لڑکیاں ان کے نیچے بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ جن کے رنگین آنچل ہوا سے لہراتے ہوئے قوس وقزح کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ایک دم سے اسکا دل چاہا کہ نہر کنارے گھوما جائے۔ یہ سوچتے ہی وہ اپنا کمرہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ نہر کی اور جاتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے مسحور کن جھونکے اپنے چہرے پر تھپتھپاتے محسوس کرتے ہوئے وہ بڑھتی چلی گئی۔

پھر نجانے کب ناصر اس کے قریب آ گیا۔

''ہیلو دیا''

''ہیلو'' دیا نے حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ اس کی یہ مداخلت اسے بالکل اچھی نہ لگی تھی۔ وہ اکیلے گھومنے میں زیادہ لطف محسوس کرتی تھی۔ جب سوچیں آزاد ہوتیں اور کوئی بھی ان میں دخل اندازی نہ کرسکتا۔

ناصر اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ بہت محنتی اور ذہین طالب علم تھا۔ شلوار کرتے میں ملبوس بال پریشان لاپروا اور لاابالی سا' جو ہر وقت کچھ سوچتا ہوا محسوس ہوتا۔

''آپ تنہا کہاں جارہی ہیں؟'' وہ ساتھ ہی ہولیا۔

''آج موسم کی ٹھنڈک اور چاندنی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں''

''اکیلے ہی'' اس نے پوچھا۔

''ہاں مجھے اکیلا رہنا اچھا لگتا ہے''

مگر وہ نہایت ڈھٹائی سے ساتھ چل پڑا۔

''مجھے بھی اکیلا رہنا پسند ہے مگر آج نہیں''

''کیوں؟''

''آج دل چاہتا ہے کہ انہی درختوں تلے بیٹھ کر کسی سے خوب باتیں کروں......''

''کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہر موضوع پر۔ دنیا کے ہر موضوع پر''

''اچھا''

''ہاں آپ بور تو نہیں ہورہیں''

''اگر ہاں کہوں تو آپ چلے جائیں گے''

''نہیں''

''کیوں''

''میں پڑھتے پڑھتے تھک گیا ہوں' گھومنا اور باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر کسی اچھے ساتھی کے ساتھ''

''اچھا تو کوئی دوست نہیں ملا''

''ہیں تو بہت مگر......آج تو میں سوچ کے نکلا تھا''

''کیا''

''کہ آپ مل جائیں''

''وہ کیوں''

''پتہ نہیں دل چاہا تھا''

''آپ کا دل جو بھی چاہے آپ کر لیتے ہیں''

''ہاں جو چیز بس میں ہو وہ تو ضرور کرتا ہوں''

''آپ کا دل کیا چاہ رہا ہے''

''اب'' وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ''اب دل چاہتا ہے کہ خوب باتیں ہوں ہم دونوں یونہی دور تک چلتے رہیں''

''پھر''

''پھر یہ کہ خوب بھیگ جائیں''

''آپ کی یہ خواہش تو اب پوری نہیں ہوسکتی''

''وہ کیوں''

''اس لئے کہ بادل چھٹ چکے ہیں اور بارش کا کوئی امکان نہیں ہے''

''ارے یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں'' اس نے کہا اور دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

تارکول کی سرمئی ڈھلی ڈھلائی سڑک پر پانی میں چاند کا عکس دیکھتے ہوئے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جھاڑیوں میں جگنوؤں نے آنکھ مچولی شروع کردی اور وہ اپنے اپنے ہوسٹل لوٹ آئے۔

پھر یہ روز کا معمول سا بن گیا۔ جب بھی شام کو وہ سیر کے لئے نکلتی ناصرا سے راستے میں مل جاتا۔ دونوں دیر تک چلتے رہتے۔ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ ادب، سیاست، مذہب اور آرٹ کے متعلق کبھی کبھی کسی موضوع پر جھڑپ بھی ہو جاتی جب کبھی چلنے اور بولنے کی زیادتی سے تھک جاتے تو نہر کنارے کینٹین پر بیٹھ کر گرم گرم چائے پینے لگتے۔

یونہی بہت سے دن گزر گئے۔ ناصر سے ملنا، نہر پر گھومنا اور بحث کرنا ایک معمول سا بن گیا کیونکہ وہ ذرا مختلف قسم کا لڑکا تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر شاعری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے کبھی باتوں کے دوران اس کی ذات میں دلچسپی ظاہر نہ کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے قریب رہ کر وہ خود کو محفوظ تصور کرتی۔

ایک دن یوں ہوا کہ وہ حسب معمول چلتے ہوئے دور نکل گئے' ایکدم سورج کو بادلوں نے گھیر لیا۔ اور خوب زور شور سے بارش شروع ہوگئی۔ یہ برسات کا موسم بھی خوب ہوتا ہے ابھی دھوپ ابھی چھاؤں اور کبھی کبھی تو دھوپ میں بھی بارش ہونے لگتی ہے۔ بہر حال یہ خوبصورت موسم جسے برسات کہتے ہیں کبھی کبھی زحمت بھی بن جاتا

ہے۔ اس ایکا ایکی بارش کے حملے سے وہ گھبرا گئی دور نزدیک کہیں بھی سایہ نہ تھا وہ ہوسٹل سے بہت دور نکل آئے تھے۔ سو بھیگنا لازمی تھا اور دونوں بھیگ گئے۔

جب مٹی سے سوندھی سوندھی باس اٹھ کر ہوا میں پھیلنے لگی تو سردی سے کانپتے ہوئے اس نے ناصر کی طرف دیکھا۔ جو نہایت انہماک سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب ہولناک سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''تم بہت خوبصورت ہو''

دیبا گھبرا سی گئی۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ناصر......''

''میں آج..........تمہارے ہونٹ چکھنا چاہتا ہوں''

اس کے جسم سے نکلتی ہوئی گرمی اور جوانی کی خوشبو ذہن پر چھانے لگی۔ لیکن ایکدم سے اس نے خود پر قابو پالیا۔

''نہیں......نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہارے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا''

یہ کہہ کر دیبا نے بھاگنا شروع کر دیا۔ تیز بہت تیز ناصر کی گرم گرم سانسیں اسے ابھی بھی اپنے کندھے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سرپٹ دوڑ رہی تھی۔

ناصر حیران و نادم سا وہیں کھڑا تھا۔

دیبا اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گرگئی۔ سردی اور خوف سے دیر تک کانپتی رہی۔

اس روز کے بعد دیبا نے شام کو باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ناصر سے ڈیپارٹمنٹ میں ملاقات ہوتی۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہتا۔ مگر دیبا کو اس سے نفرت ہو چکی

تھی۔ ادب آرٹ لٹریچر پر باتیں کرنے والا ناصر بھی بالکل مرد ہی نکلا۔ جو لاکھ ادھر ادھر کی باتیں کریں پر ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے وہ عورت کو صرف عورت سمجھتے ہیں اور بس......

پڑھائی ختم ہوتے ہی دیبا کی شادی ہوگئی۔ زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی۔ جس میں کوئی تنوع نہیں تھا۔ کوئی حسن نہیں تھا، سب کتابیں اور ڈگریاں الماریوں میں بند ہوگئیں گھر کے کام کاج...... بچے پیدا کرنا اور چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی رات کو شوہر کے پہلو میں سو جانا۔

سردی، گرمی، بہار، برسات سارے موسم آتے اور انہی معمولات میں گزر جاتے۔ جب کبھی اسے گھر کے کاموں سے فرصت ملتی تو برآمدے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کرتے ہی نجانے ناصر کہاں سے چلا آتا۔ اس کے دل میں یہ خواہش جاگتی خوب زوروں کی بارش ہو۔ وہ دونوں ایک بار پھر یونہی بھیگ جائیں۔ ناصر پھر سے وہی خواہش کرے اور وہ بھاگنے کی بجائے اس کے سینے سے لپٹ جائے۔ یہاں تک کہ ان کے جسموں سے اٹھتی ہوئی مہک ایک دوسرے میں جذب ہو جائے۔

اسی لمحے کوئی بچہ رونے لگتا۔ وہ سپنا پھر سے ٹوٹ جاتا اور وہ اٹھ کر بچے کیلئے فیڈر ڈھونڈنے لگتی۔



جنگلی جانور

گلی میں ڈگڈگی بج رہی تھی۔ بچوں نے شور مچایا۔ ''ریچھ نچانے والا آیا''

یہ سنتے ہی پپو، گڈو، راجو اور رانی دروازے کی طرف لپکے

''کہاں جا رہی ہو رانی'' دادی اماں کی آواز آئی۔

''دادی جان گلی میں ریچھ والا آیا ہے'' رانی نے اچھلتے ہوئے کہا۔

''باہر مت جاؤ۔ تم نے لال فراک پہن رکھی ہے''

''میں باہر کیوں نہ جاؤں؟'' رانی نے ضد کی۔

''ریچھ لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ خاص طور پر جنہوں نے سرخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہوں''.

رانی یہ سن کر ڈر گئی اور اس کے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔

وہ دادی جان کے پاس جا کر ان کے بستر میں ہی بیٹھ گئی۔

''دادی جان...... پھر کیا ہوتا ہے؟''

''ریچھ لڑکی کو اپنے گھر لے جاتا ہے اور اس کے تلوے چاٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کے پاؤں پتلے ہو جاتے ہیں اور پھر وہ چل پھر نہیں سکتی''

''پھر وہ لڑکی اپنے گھر واپس نہیں آتی؟''

''نہیں کبھی نہیں.......... وہ ہمیشہ کیلئے ریچھ کے گھر میں رہتی ہے۔ اپنوں سے بچھڑ جاتی ہے۔ اسے اس ریچھ کی عادت ہو جاتی ہے''

''دادی اماں وہ کھانا کہاں سے کھاتی ہے؟''

''ریچھ ہی اس کے لئے کھانے کا انتظام کرتا ہے''

''دادی جان ریچھ تو جانور ہے۔ لڑکی کو کاٹتا نہیں؟''

''بیٹی جنگلی جانور کا کیا بھروسہ؟ غصہ آنے پر کاٹ بھی سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے'' یہ سن کر رانی اور بھی سہم گئی اور دادی جان کے آنچل میں چھپ کر بیٹھ گئی۔

گلی میں ڈگڈگی بجتی رہی۔ بڑا سا بھالو ڈگڈگی کی تال پر جھومتا رہا۔ ناچتا رہا۔ بچے تالیاں بجاتے رہے۔ مگر رانی دادی جان کی آغوش میں چھپی رہی۔

اس کے بعد جب کبھی گلی میں ریچھ نچانے والا آتا محلے کے سب بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے مگر رانی اپنے گھر کے کسی کونے میں دبکی رہتی کہ کہیں وہ ریچھ اسے نہ لے جائے۔ اپنوں سے دور نہ کر دے...... اور اس کے تلوے چاٹ کر اسے چلنے پھرنے سے معذور نہ بنا دے...... دن گزرتے رہے۔ رانی میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہو گئی۔ دادی جان نے ضعیفی کی وجہ سے قصے کہانیاں سنانا چھوڑ دیا۔ پپو، گڈو بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ راجو نے آرمی جوائن کر لی اور سب بھائیوں کی لاڈلی رانی گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ اماں، ابا اور دادا جان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ رانی نے دنوں میں ایسا قد کاٹھ نکالا کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ اس کی سنہری رنگت میں گلاب جھلکنے لگے اور شانوں پر لہراتے بالوں کا رنگ گہرا ہو گیا۔ کاجل بھری آنکھوں میں لال ڈورے آپ ہی آپ نجانے کہاں سے

آ گئے کہ اس سے نظر ملانے کی کسی میں تاب نہ رہی۔ اس کے روپ کی خوشبو شہر بھر میں پھیل گئی اور دھڑا دھڑ رشتے آنے لگے۔ پہلے تو اماں، ابا نے تنہا رہ جانے کے خوف سے ہر رشتے کو انکار کیا۔ ''کہ رانی ابھی بچی ہے اس کی عمر ہی کیا ہے؟'' مگر جب وہ بی اے کے آخری سال میں پہنچی تو شیراز کے گھر والوں کی ضد کے سامنے انہیں جھکنا ہی پڑا۔

شیراز کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ اس نے جب سے رانی کو دیکھا ہے بس یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ شادی کروں گا تو رانی سے ورنہ عمر بھر یونہی کنوارہ رہوں گا۔ شیراز شہر کے بہت بڑے ہوٹل کا مالک تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا اور لاڈلا۔ اس کی ہر ضد پوری کرنا اور اس کی پسند کا ہر کھلونا خرید کر دینا اس کے ماں باپ نے بچپن سے ہی اپنا فرض سمجھا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے لاڈلے بیٹے کی یہ ضد کیونکر پوری نہ کرتے۔

شیراز اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و جمال اور مردانہ وجاہت میں بھی یکتا تھا لہٰذا رانی بھی اس کی ایک جھلک دیکھ کر اسے اپنا سمجھ بیٹھی۔ اس کی سکھیاں اسے چھیڑتیں۔ ''رانی تم بہت خوش قسمت ہو جسے اس قدر چاہنے والا شوہر مل رہا ہے''۔

بی اے کے امتحان ختم ہوتے ہی شادی کا دن مقرر کر دیا گیا اور آخر وہ دن آ ہی گیا۔ جب لال جوڑا پہنا کر اماں، ابا اور بھائیوں نے اپنی نازک سی پھولوں کی طرح پروان چڑھنے والی رانی کو آنسوؤں، آہوں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

ماں باپ کی جدائی، زیورات کا بوجھ اور لوگوں کے ہجوم سے گھبرائی ہوئی رانی نڈھال ہو رہی تھی' آدھی رات کو اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ شیراز اس کے

پاس بیٹھ کر پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ کہتا رہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔ اچانک بتی بجھ گئی اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بڑا سا ریچھ اس کے بستر پر آگیا ہے۔ جو اسکے پاؤں، تلوے، ٹانگیں، گردن اور نا جانے کہاں کہاں چاٹ رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کے دانت اور پنجے اس کے نرم گوشت میں پیوست ہو جاتے اور وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھتی۔ اسے یاد آیا کہ دادی اماں سچ ہی کہتی تھیں لال کپڑے پہننے والی لڑکیوں کو ریچھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ صبح ہونے تک وہ اس قدر نڈھال ہو چکی تھی اور نقاہت محسوس کر رہی تھی کہ اس سے اٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے جگانے کیلئے آنے والی عورتیں اس کی حالت پر ہنس رہی تھیں۔

رانی نے گھبرا کر اپنے پاؤں دیکھے۔ وہ بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ ابھی پتلے نہیں ہوئے تھے۔ گویا ان میں ابھی چلنے کی طاقت باقی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی تھوڑی ہمت بڑھی اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دن تک لوگوں کا ہجوم برقرار رہا۔ وہ دن بھر نندوں اور ساس کی لاڈلی بنی رہتی۔ ان کے مشوروں سے کپڑے بدلتی، سنگھار کرتی اور رات ہونے کا انتظار کرتی کیونکہ اسے اس ریچھ کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔ جو بتی بجھتے ہی اس کے کمرے میں آجاتا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ساس نندوں کے چہروں سے بیوٹی کلینک کا میک اپ اترا تو ان کے اصلی چہرے سامنے آنے لگے۔ ایک دن تو وہ سب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے گھر میں صفیہ، رضیہ، ذکیہ، ثریا، شاہدہ زاہدہ کی بجائے چند مکار لومڑیاں پھر رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی ساس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ کسی خونخوار بھیڑیئے جیسا ہو رہا تھا۔ جس کے جبڑے کھلے ہوئے تھے اور دانتوں

سے کسی جاندار کا تازہ لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر اپنے سسر کے کمرے کی طرف بھاگی مگر وہاں بستر پر ایک گیدڑ عینک لگا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ ''یا اللہ یہ کیا ہوا؟''

''یہ کیسا گھر ہے؟ یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں شیراز نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ ''یہ سب کیا ہے شیراز؟'' رانی نے روتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں جو تمہارا ہوں۔ میری خاطر بس میری خاطر تمہیں یہ سب برداشت کرنا ہوگا''

''مگر شیراز.......... میں تو گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ تو جنگل ہے۔ جہاں ہر طرف جانور ہی جانور ہیں۔ انسان ایک بھی نہیں.......... میں زندہ کیسے رہوں گی؟''

''تم میرے لئے زندہ رہو گی...... میری محبت کیلئے...... اس لئے تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی'' یہ کہہ کر شیراز نے اس کے پاؤں چاٹنے شروع کر دیئے اور رانی نے نڈھال ہو کر اپنا وجود اسکے سپرد کر دیا۔

شیراز کے پیار سے بے بس ہو کر اس نے اس جنگل نما گھر میں رہنا قبول کر لیا۔ دن بھر اسے مکار لومڑیوں، خونخوار بھیڑیوں اور گیدڑوں کی منحوس اور خوفناک شکلیں اور آوازیں برداشت کرنا پڑتیں۔ رات ہوتے ہی اسے شیراز کا سہارا مل جاتا اور وہ دن بھر کی اذیتوں کو بھول جاتی۔

روہن اور موہن کے پیدا ہونے تک شیراز کی اس میں دلچسپی برقرار رہی۔ پھر اسکے معمولات میں فرق آنا شروع ہو گیا۔ اس نے دن کے ساتھ ساتھ رات کو بھی گھر

سے باہر رہنا شروع کر دیا۔ پہلے پہلے تو رانی نے دبے لفظوں میں شکایت کی مگر جب گھر پر عورتوں کے ٹیلی فون آنا شروع ہوئے تو اس نے چیخ کر احتجاج کرنا چاہا۔ ''یہ سب کیا ہے شیراز؟ تم رات بھر گھر سے باہر رہتے ہو۔ پھر یہ عورتیں کون ہیں؟''

یہ سنتے ہی شیراز کی شکل بدل گئی۔ اس کے چہرے کے خدوخال تبدیل ہو گئے اور وہ غصے سے پھنکارتا ہوا رانی کی طرف جھپٹا دوسرے لمحے رانی فرش پر پڑی چیخ رہی تھی اور شیراز لاتوں اور گھونسوں سے اسے پیٹ رہا تھا۔ اچانک شیراز نے پاس پڑا ہوا بیٹ اٹھایا اور رانی پر پے در پے وار شروع کر دیئے۔ محلے والے اکٹھے ہوئے مگر کوئی بھی رانی کو اس سے نہیں چھڑوا رہا تھا۔ اس کی چیخیں فرش سے عرش تک پہنچ رہی تھیں مگر اسے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ بس دور کہیں دادی اماں کہہ رہی تھیں۔

''بیٹی جنگلی جانور کا کیا بھروسہ کب غصہ آ جائے؟ پھر وہ کاٹ بھی سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے''



کرنوں کی سیر

پھر یوں ہوا کہ مجھے محبت ہو گئی۔۔۔ کتنا عجیب انکشاف تھا یہ، پرندوں کے پیچھے بھاگتے، درختوں کے نیچے جا کر پریوں کو آوازیں دیتے۔ گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے اور آسمان پر اڑتی رنگ برنگی پتنگوں کو گنتے ہوئے۔۔۔ ایک دم پتہ چلا کہ مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ اب کیا کرنا چاہیے؟

میں نے آئینے میں بار بار اپنی شکل دیکھی۔۔ بالوں کو مختلف انداز میں سنوارنے کی کوشش کی۔۔۔ دوپٹہ اوڑھنے کے نئے طریقے سوچے۔۔۔ اور پھر سوچا رات بھر چھت پر جا کر تارے گننے چاہئیں۔۔۔ تا کہ یہ انکشاف حقیقت کا روپ دھار لے۔

چھت پر جا کر کافی دیر انتظار کیا۔۔۔ اور جب تارے نکلنا شروع ہوئے تو آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں۔ لہٰذا محبت کرنے کے سلسلے کا پہلا پروگرام یعنی ''تارے گننا'' تکمیل کے مراحل طے نہ کر سکا اور میں اپنے کمرے میں آ کر چپ

چاپ سوگئی۔

دوسرے روز سو کر اٹھی۔ آئینہ دیکھا تو چہرہ معمول کے مطابق ہی تھا۔ کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جس سے پتہ چلتا کہ ہم ایک عدد محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

بہت سوچا کہ عشق اور عاشقوں کی نشانیاں کیا کیا ہوتی ہیں؟ گریبان چاک ہونا چاہیے۔۔۔ مگر ایسی عریانی اور فحاشی والی محبت کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے لہذا یہ تجویز قابل قبول نہ تھی۔ گھر چھوڑ کر جنگل میں نکل جانے کا پروگرام بھی قابل عمل نہ تھا۔ کیونکہ ہمیں اپنے شہر کے قریب ترین کسی جنگل کا پتہ معلوم نہ تھا۔

''پھر محبت کس طرح کی جائے؟'' کافی مشکل بات تھی۔ مگر مشکل کام کرنے کی ہی تو ہمیں خواہش رہی تھی۔۔۔ محبت کرنے کے لئے بس ایک عدد محبوب کی ضرورت تھی اور آپا کی شادی میں بارات کے ساتھ آنے والا ایک لڑکا ہمیں اچھا لگا تھا اور ہمارے خیال میں اس میں محبوب بننے والی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ لانبا قد۔۔۔ سیاہ گھنے بال۔۔۔ کشادہ پیشانی۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ سانولا یعنی نمکین رنگت۔۔۔ بس اسے دیکھتے ہی ہم نے سوچ لیا کہ یہی ہے وہ جس کی ہمیں تلاش تھی اور ہم نے فوری طور پر اس سے محبت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بارات چلی گئی۔ آپا رخصت ہو گئیں مگر ہم چونکہ محبت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا اپنے خیالوں میں گم رہے۔ کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کیا کرتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ یا اس کا دولہا بھائی سے کیا رشتہ تھا؟

شاید محبت کرنے کے لئے ان سب باتوں کا پتہ ہونا غیر ضروری ہوتا ہے۔ محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔

جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اندھی ہوتی ہے۔ ہم بھی اپنی اندھی محبت پر اعتبار کر بیٹھے۔

صبح اٹھتے تو آئینہ دیکھتے ہوئے مسکرا کر اسے ''ہیلو'' کہتے وہ مسکرا دیتا۔۔۔ اور پھر دن بھر اس کے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنتا۔ دیکھو میں کالج جا رہی ہوں۔ میرا انتظار کرنا۔ بس جلدی آ جاؤں گی۔ کہیں چلے مت جانا۔ وہ مسکراتا۔ میں ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے کالج چلی جاتی۔

پہلا پیریڈ شروع ہوتے ہی وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ ''تم یہاں بھی آ گئے ہو'' میں حیرت اور خوشی سے پوچھتی۔

''تمہارے بغیر دل نہیں لگتا'' وہ شرارت سے کہتا میں جھینپ کر رہ جاتی۔

دن بھر کالج میں وہ یونہی بیٹھا شرارت سے مجھے دیکھتا رہتا اور میں لیکچر سننے کی بجائے کاپی پر اس کا نام لکھتی رہتی۔ اس کا نام ''انعام'' ہونا چاہیے۔ ہاں وہ میرے لئے ایک انعام ہی تو تھا۔ میری کاپی کے ہر صفحے پر یہی نام لکھا تھا۔ گھر آ کر میں بستر میں لیٹتی تو وہ پہلو والی کرسی پر بیٹھ کر مجھے کہانیاں سنانے لگتا۔ میں مسحور سی اس کی کہانیوں میں گم ہو کر سو جاتی۔

شام کی چائے برآمدے میں بیٹھ کر پیتے ہوئے وہ مجھے بتاتا کہ اسے خزاں کا موسم بہت پسند ہے۔ خاص طور پر دسمبر کا مہینہ۔ کبھی کبھی دسمبر کی کسی صبح وہ مجھے نہر کے کنارے لے جاتا۔ سردی، کہر اور ہوا سے اڑتے ہوئے زرد پتے دیکھتے ہوئے میں ٹھٹھرتی ہوئی اس کے ساتھ دور تک چلتی رہتی۔

اتنی خوبصورت صبحیں پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ زندگی کتنی

خوبصورت ہوگئی تھی۔ پھولوں کے رنگ زیادہ گہرے اور شوخ لگنے لگے تھے۔ شامیں سرمئی اور راتیں سہانی ہوگئی تھیں۔

دن گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا سورج کی روشنی اور چاند کی چاندنی جیسے ہر شے سے مجھے عشق ہوگیا تھا۔۔۔ساری کائنات بس حسین ہی حسین تھی۔۔۔غم، دکھ اور بد صورتی کہیں نہیں تھی۔

اس نے مجھے دور دیس کی کہانیاں سنائیں، جھیلوں، آبشاروں، تتلیوں اور جگنوؤں کے گیت سنائے۔۔۔ غالب، فیض، منیر نیازی اور گلزار کے شعر یاد کرائے۔۔۔منٹو، کرشن چندر بیدی، عصمت چغتائی، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی کتابیں لا کر دیں۔ مٹی کی خوشبو اور بارش کی رم جھم کے ذائقے سے آشنا کیا۔۔۔ اور میں ایک نئے نشے میں ڈوبتی چلی گئی۔۔۔ واقعی کائنات محبت ہے اور محبت ہی حسن ہے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ میرے سامنے آگیا۔ آپا کی بارات میں آیا ہوا لانبے قد، سیاہ گھنے بالوں، کشادہ پیشانی، سانولی رنگت بڑی بڑی آنکھوں والا لڑکا۔۔۔آپا نے مجھے ملواتے ہوئے کہا۔

''نوشین۔۔۔ یہ عمران ہے۔ تمہارے دولہا بھائی کا بچپن کا دوست''

''نہیں اس کا نام تو انعام ہے'' میں نے سوچا اور مجھے ایسے لگا جیسے میں ایکدم کسی طلسم کدے میں واپس آگئی ہوں۔

''آپ کیا کرتے ہیں''؟

''میری ایک بڑی مارکیٹ میں کپڑے کی دکان ہے'' میرے ذہن پر ایک زور

دار ہتھوڑا پڑا۔

''آپ نے کبھی پھولوں سے، جگنوؤں سے، تتلیوں سے باتیں کی ہیں''۔

''جی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ہم تو سارا دن دکان پر رہتے ہیں، شام کو دوستوں کے ساتھ ہوٹلنگ کرتے ہیں یا پھر کوئی فلم وغیرہ دیکھ لیتے ہیں''

''آپ نے دسمبر کی کہر آلود صبح میں زرد اڑتے پتے بھی نہیں دیکھے''

''ہم تو دس بجے صبح سو کر اٹھتے ہیں۔ گیارہ بجے دکان کھولتے ہیں''

''آپ کو منٹو کی کہانیاں اور فیض کی شاعری یاد ہے''

''وہ کون تھے؟ ہماری تو تعلیم ہی پرائمری تک ہے۔ ویسے بھی کتابوں میں کیا رکھا ہے جی۔ انسان کے پاس نوٹ ہونے چاہئیں نوٹ۔۔۔ کتابوں میں سر کھپا کر کیا ملتا ہے جی۔۔۔ چند ہزار کی افسری۔۔۔ اتنے پیسے تو ہمارے نوکر لے لیتے ہیں جی۔۔۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، خوابوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور جذبے تو بالکل ہی بے کار چیز ہوتے ہیں۔ بھلا یہ محبت بھی کیسی اندھی چیز ہے یہ بھی نہیں دیکھتی کہ کس انسان سے ہوگئی ہے۔''

میں نے بے دلی سے اسے خدا حافظ کہا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی۔ دل پر بوجھ لئے ہوئے۔۔۔ اپنے چکنا چور خواب اور کرچی کرچی خواہشیں لئے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ وہ تو کمرے میں موجود تھا میرے سامنے آئینے میں مسکرا رہا تھا۔۔۔

''انعام تم یہاں ہو'' وہ ہنسنے لگا۔۔۔ چلو نہر کنارے چلیں۔۔۔ آج چاندنی رات ہے۔۔۔ چاند کو پانی میں ڈوبتا دیکھیں گے۔۔۔ چاند تو پانی میں کبھی نہیں

ڈوبتا۔۔۔ہاں اس کی کرنیں پانی کو بھی روشن کر دیتی ہیں۔

دل پر پڑا بوجھ ایکدم ہٹ گیا۔محبت اپنی پوری طاقت کے ساتھ ابل پڑی۔اور مجھے پتہ چل گیا کہ مجھے جس سے عشق ہے وہ تو میرے وجود کے اندر ہی کوئی ہے۔باہر کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔اور میں اس کے ہمراہ چاند کی کرنوں کی سیر کو چل پڑی۔



نئی عورت نیا مرد

نازو نے جمیل کو 20 برس پہلے دیکھا تھا۔

سردیوں کی ایک خوبصورت صبح تھی' ائرلائن میں اس کی نوکری کا پہلا دن تھا۔وہ ڈرتے گھبراتے ہوئے اپنے باس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

تیکھے نقوش، ذہین آنکھوں اور پیشانی پر بکھرے گھنے بالوں والا شخص میز کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔پہلی نظر میں ہی وہ نازو کے دل کو بھا گیا......اس کے من میں ہلچل سی مچ گئی یہ تو بالکل ویسا ہی تھا، جیسا اس نے اپنے لئے جیون ساتھی کا سوچا تھا۔

مگر جمیل کے چہرے پر پرخلوص مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔''آیئے مس نازو تشریف رکھیے''اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تب نازو کو احساس ہوا کہ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔اپنی اس حرکت پر اسے پشیمانی بھی ہوئی اور وہ جلدی سے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ کہاں رہتی ہیں؟''

''کالج میں آپ کے مضامین کیا تھے؟''

''آپ نے یہ جاب کیوں پسند کی؟''

"چند دن میں آپ کا دل یہاں لگ جائے گا۔ ابھی تو آپ کو اجنبیت محسوس ہو رہی ہوگی" وہ بہت ساری باتیں کر رہا تھا۔ نازو اس کی باتوں کا مختصر جواب دے رہی تھی کیونکہ وہ زیادہ دیر اس کمرے میں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر طوفان جیسی ہلچل تھی اور شاید حسن میں عجیب سی کشش ہوتی ہے۔ انسان اسکی طرف کھنچتا بھی ہے اور اس کے حصار سے نکلنا بھی چاہتا ہے...... شاید اسے ڈر ہوتا ہے کہ وہ قید ہو جائے گا ...... مگر یہ ڈر اس کا وہم ہوتا ہے کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس حصار میں آ چکا ہوتا ہے...... اور اب وہ فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا ہوتا ہے...... نازو کے دل میں بھی فرار کی خواہش ابھر رہی تھی...... اسی دوران اس کی ساتھی چند اور لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں تو نازو کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے جمیل سے اجازت چاہی۔

"سر میں اپنا سامان لے آؤں"

"جی پلیز" جمیل نے رواداری میں کہا۔

اور وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گی۔

نازو کی بچپن کی خواہش تھی کہ وہ کسی ائر لائن میں کام کرے۔ جہاز پر بیٹھ کر دنیا بھر کا سفر کرنا کتنی خوبصورت بات تھی۔ انسان ملکوں ملکوں سیر بھی کر لیتا ہے دنیا بھر کے لوگوں سے ان کے کلچر سے، تاریخ سے رہن سہن اور تہذیب سے آشنا بھی ہو جاتا ہے۔

چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد اسے جہاز پر ڈیوٹی کرنے کی اجازت مل گئی۔

اس کی سینئر فضائی میزبان اس کے ساتھ نہایت پیار و محبت کا برتاؤ کرتیں اور اس کی ہر طرح سے مدد و رہنمائی کرتیں۔

اس کو اپنی جاب بہت اچھی لگنے لگی۔ میک اپ، بالوں کے سٹائل اور کپڑوں کی تراش خراش سے اسکے سراپا میں نئی دلکشی آ گئی تھی اور اسکے حسن میں نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بہت سارے مرد ساتھی اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور ان کی نظروں میں اپنے لئے نئے نئے پیغام دیکھ کر وہ نظریں جھکا کر دل ہی دل میں اتراتی ہوئی گزر جاتی۔ اس کے دل میں کسی کے لئے پیار یا محبت کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا...... اس کے دل میں بس ہر وقت ایک ہی خواہش رہتی اور وہ یہ کہ جمیل سے کہیں ملاقات ہو جائے۔

جہاز میں بیٹھے ہوئے وہ جمیل کے بارے میں سوچتی رہتی...... دوسرے ملکوں کے شاپنگ سنٹرز میں جا کر ہر سٹور پر رک کر اسے ہر چیز میں جمیل کا چہرہ دکھائی دیتا۔ سمندر کے کنارے...... ہوٹلوں کے سوئمنگ پول، ائر پورٹ کے لاؤنج...... فلک بوس عمارتوں اور کشادہ سڑکوں پر چلتے ہوئے وہ ایک ہی چہرے کے دھیان میں کئی کئی لمحے گزار دیتی اور اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔

اپنے خیالوں میں مگن رہنے کی وجہ سے اس کی ساتھی فضائی میزبان اکثر اسے چھیڑتیں۔

"بھئی وہ کون ہے؟...... کس کے خیالوں میں رہتی ہو؟ کبھی ہماری بھی تو اس سے ملاقات کراؤ" لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ جمیل شادی شدہ ہے، دو بچوں کا باپ ہے اور پھر وہ انکا بگ باس تھا۔ اس کے دفتر میں جانا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ پھر وہ اسکے بارے میں اپنی دوستوں کو کس طرح بتا سکتی تھی۔ وہ ان کے مذاق کا نشانہ بنتی اور وہ یقیناً اسے کہتیں کہ نازو بی بی آسمان پر چلنا چھوڑ دو۔ ہر جہاز کو

زمین پر ہی اترنا ہوتا ہے"۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے اور پھر ایک دن نازو نے بھی شادی کرلی...... احمر اس کے جہاز کا مسافر تھا۔ اس نے جہاز سے اترتے ہی اسے شادی کا پیغام دے ڈالا...... نازو غصے سے لال پیلی ہوگئی۔ اس نے اسے خوب برا بھلا کہا مگر احمر نہایت ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ روزانہ اسے فون کرتا اور اپنی خواہش کا اظہار کرتا۔ نازو کا خیال تھا کہ وہ بھی عام مردوں جیسا ہے۔ جن کا مقصد عورت کا جسم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ خواہ اس کے لئے ان سے شادی ہی کرنا پڑے۔

نازو کے انکار کے ساتھ ساتھ احمر کا اصرار بڑھتا گیا اور نازو جو جمیل کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھتی تھی اسے معلوم تھا کہ وہ جمیل کو زندگی بھر نہیں پاسکتی۔ احمر کی ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اور پھر نازو اور احمر شادی کے بندھن میں بندھ گئے...... جلد ہی نازو کے آنگن میں دو پیارے بچے کھیلنے لگے اور احمر اس سے بے نیاز ہوگیا۔

نازو ایک بار پھر تنہائی کا شکار ہوگئی...... اس کی عمر ڈھل رہی تھی۔ اتنے برس نوکری کرتے ہوئے وہ تھک سی گئی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ آرام کرے...... گھر بیٹھے اپنے بچوں کو دیکھے اور اس کے بچوں کا باپ اس کا خیال رکھے۔

مگر احمر کا رویہ اس کے ساتھ ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ وہ اس کی ساتھی میزبان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا اور گھر آکر اس کا جسم ڈھلک جانے اور اس کی عمر بڑھنے کے طعنے دیتا۔ احمر کو بچوں کی پروا بھی نہ رہی تھی اس نے گھر کا خرچہ دینا بھی بند کردیا تھا اور کئی کئی دن گھر سے باہر رہنا شروع کردیا تھا۔

نازو کے لئے دنیا ویران ہوچکی تھی۔ گھر جہنم بن چکا تھا۔ بچے بھی گھر کی صورتحال سے پریشان ہوکر چڑچڑے سے ہوگئے تھے۔ نازو کا دل چاہتا کہ خودکشی کرلے یا پھر گھر چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ مگر اپنے بچوں کی خاطر وہ ایسا بھی نہیں کرسکتی تھی۔

زندگی کا بوجھ اٹھائے نوکری کیئے جارہی تھی۔ ایک دن جمیل اس کے سامنے آگیا۔

نازو حیران رہ گئی۔ اس کے سینے میں دل زور سے اچھلا اور پرانی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔

جمیل کے پروقار چہرے اور ماتھے پر سرمئی بالوں کی لٹ نہایت شاندار لگ رہی تھی۔

"سر آپ کیسے ہیں" نازو نے نظریں جھکاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نازو...... تم تو اب تک اتنی ہی خوبصورت ہو......" جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا اور نازو مدت کے بعد اپنی تعریف سن کر شرما گئی۔

"کبھی فرصت ہو تو آجایا کرو...... میرا آفس ادھر ہی ہے" جمیل نے کہا۔

"جی اچھا" نازو نے جواب دیا اور جمیل آگے بڑھ گیا۔ پھر جب کبھی وہ بہت تنہا اور اداس ہوتی تو جمیل کے دفتر چلی جاتی۔ وہ اس کو کافی پلاتا۔ اس کے پسندیدہ موضوعات پر باتیں کرتا...... اور رخصت کے وقت اسے دروازے تک چھوڑنے آتا۔

نازو کو محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی کی تلخیاں کم ہوتی جارہی ہیں۔ احمر اگر اس کو نظرانداز کرکے دوسری عورت کی آغوش میں چلا گیا ہے تو اسے بھی اپنی تنہائی دور

کرنے کا سہارا مل گیا ہے۔ عورت اگر ادھیڑ عمر ہوتی ہے تو اس شخص کیلئے جو اس کے ساتھ زندگی کے بہترین سال گزارتا ہے...... ورنہ دوسرے لوگوں کیلئے تو اس میں اتنی ہی کشش ہوتی ہے جو کسی بھی عورت میں ہو سکتی ہے۔

جمیل کے ساتھ اس کی بے تکلفی بڑھتی گئی اور پھر ایک دن جمیل نے اسے گلے لگا لیا۔ نازو کو محسوس ہوا جیسے آسمان زمین پر جھک آیا ہے...... گویا اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ وہ خواہش جو اس نے 20 برس پہلے جمیل کو پہلی بار دیکھ کر کی تھی۔ شاید وہ سارے برس...... وہ سارے لمحے جو درمیان میں تھے ختم ہو گئے تھے۔

اور نازو اپنے محبوب کی بانہوں میں اسکے سینے کا لمس اور اس کے سانسوں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی...... اس لمحے وہ ایک نئی عورت تھی اور جمیل اسکا نیا مرد............



فٹ پاتھ کا بچہ

صبح ہی صبح عجیب سا شور تھا جیسے کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔

حامد نے کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر ابھی ٹریفک شروع نہیں ہوئی تھی۔ سورج بادلوں کی قید سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ رات بھر پڑنے والی اوس کے قطرے ہر چیز پر نمایاں تھے۔ گلی کے کتے تھک ہار کر کھمبوں کے نیچے سو رہے تھے اور دن بھر بھیک مانگ کر نشہ کرنے والے بھکاری فٹ پاتھ پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔

کبھی کبھی کوئی تانگہ یا رکشہ گزرتا تو اس کا شور دیر تک گونجتا رہتا، مگر اس شور کے علاوہ بھی آج ایک نیا شور تھا۔ کچھ لوگ گھروں سے نکل کر سڑک کے دائیں طرف جا رہے تھے چہ مگوئیاں کرتے ہوئے۔ حامد ان لوگوں کی حیرت پر حیران تھا۔

ایک ٹولی جو ابھی گزری تھی وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے قیامت کے آنے کا ذکر کر رہی تھی۔

ایسا کیا ہوا؟ جو لوگوں کو قیامت یاد آ رہی ہے؟

حامد ایک سکول میں ریاضی کا استاد تھا۔ صبح سویرے اٹھنا اس کی عادت تھی وہ صبح اٹھ کر نماز پڑھتا۔ چائے بناتا۔ رات کی باسی روٹی سے ناشتہ کرتا اور اپنا اکلوتا سفید کرتہ پاجامہ پہن کر سکول روانہ ہو جاتا۔

حامد نے لنڈے بازار کے قریب ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ کمرے کا کرایہ 500 روپے ماہوار تھا۔ مگر بجلی کے بل سمیت ہر مہینے مالک مکان کو سات سو روپے ادا کرتا۔ اس کی کل تنخواہ پانچ ہزار روپے تھی۔ تین ہزار وہ اپنے والدین کو گاؤں بھجوا دیتا اور باقی تیرہ سو روپے میں اس نے سارے مہینہ گزارا کرنا ہوتا تھا۔ شام کو وہ ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔ جن دنوں بچے اس سے ٹیوشن پڑھنے آتے تو اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا۔ ان اضافی روپوں سے وہ اپنے لئے گرمی یا سردی کے کپڑے اور جوتے خریدتا اور کبھی کبھار سینما جا کر فلم بھی دیکھ لیا کرتا۔

سکول جانا سکول سے واپس اپنے کمرے میں آنا اور ٹیوشن پڑھانا یہی اس کے معمولات تھے یا جب کبھی وہ فارغ ہوتا تو کھڑکی میں کھڑا ہو کر سڑک کو دیکھتا رہتا۔ لنڈے بازار کے کپڑے بیچنے والوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی رہتیں۔ دس روپے میں 20 روپے میں انگلستان لے لو، امریکہ خرید لو آؤ بابو آؤ دس روپے میں انگریز بن جاؤ۔ امریکی تحفے لے لو، جاپان کے جوتے لے لو۔

ریڑھیوں والے دن بھر آوازیں لگاتے اور لوگ ان ریڑھیوں کے گرد کھڑے ہو کر اپنی اپنی پسند کے سویٹر، جوتے پتلون وغیرہ ڈھونڈتے رہتے۔ کبھی کوئی چورن بیچنے والا یا کان کی میل نکالنے والا بھی گزرتا۔ دانت کا درد دور کرنے' آنکھوں کی بصارت تیز کرنے والا سرمہ بیچنے والے پھلوں کی ریڑھیاں بھی تھیں جن کے اطراف میں مکھیوں کے غول بھنبھناتے رہتے۔

حامد شیخوپورہ کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اسے بچپن سے ہی شہر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی خاطر حامد نے روزانہ چار چار میل پیدل چل کر

قصبے کے سکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ پھر پرائیویٹ داخلہ بھیج کر ایف اے کا امتحان پاس کر لیا اور لاہور آ کر سکول میں نوکری کر لی۔

نوکری کے دوران اس نے بی اے پاس کر ڈالا اسی لئے اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ سرکاری سکول تھا۔ لہٰذا بچوں کے ساتھ زیادہ سر نہیں کھپانا پڑتا تھا۔ وہ اپنے امتحان کی تیاری آسانی سے کر سکتا تھا۔ اب اس کی خواہش تھی کہ وہ ایم اے پاس کر لے اور پھر کسی کالج میں پروفیسر ہو جائے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر کبھی زندگی کی حقیقتیں دیکھتا اور کبھی اپنے خیالوں میں گم ہو جاتا۔

لیکن آج تو ابھی صبح کے چھ ہی بجے تھے دکانیں بند تھیں۔ نہ دکاندار آئے تھے اور نہ ہی گاہکوں کی آمدورفت شروع ہوئی تھی۔ پھر لوگ کیوں بھاگے پھر رہے تھے؟

اس کا تجسس بڑھتا گیا تو وہ کھڑکی بند کر کے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں اس نے ایک شخص کو روک کر پوچھا۔

تمہیں نہیں معلوم کیا ہوا ہے؟ اس شخص نے حیرت سے سوال کر ڈالا۔

نہیں کیا ہوا ہے؟ ارے بھئی بیٹا ہوا ہے...... بیٹا دوسرا شخص یہ کہہ کر تمسخرانہ انداز میں آگے بڑھ گیا۔

بیٹا ہوا ہے کس کے بیٹا ہوا ہے؟ یہ کونسی نئی بات ہے۔ ہمارے ملک میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ جو جتنا زیادہ غریب ہوتا ہے اس کے بچوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ بچے پیدا کرنا غریب لوگوں کی واحد تفریح ہے۔ ویسے اگر غریب لوگ بچے پیدا نہیں کریں گے تو ہوٹلوں میں کام کرنے والے چھوٹے، ریڑھیوں پر آوازیں لگانے والے، گٹر صاف کرنے والے کہاں سے آئیں گے؟ اگر

کسی کے بیٹا ہوا ہے تو اچھا ہی ہے چند برسوں میں وہ کمانے لگے گا۔

ارے بھئی بیٹا کسی کے گھر پیدا نہیں ہوا بلکہ فٹ پاتھ پر ہوا ہے۔ایک شخص نے کہا۔قیامت ہی تو ہے،فٹ پاتھ پر بیٹا۔

حامد بھی اس شخص کے ساتھ چل پڑا اور بہت سارے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس نے دیکھا دو موریہ پل کے نیچے فٹ پاتھ پر ایک پاگل عورت نیم برہنہ لیٹی تھی۔جس کے قریب غلاظت میں لتھڑا ہوا نو مولود بچہ پڑا تھا وہ عورت حیرت سے سب کو دیکھ رہی تھی۔مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوگ کس لئے جمع ہیں؟ کیا عجیب بات ہوئی ہے؟ یہ کس کا گناہ ہے؟ یہ کس کا جرم ہے؟ وہ تو اس گناہ میں شریک نہیں تھی کیونکہ ارتکاب جرم کیلئے ارادہ جرم کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اس بچے کی پیدائش میں اس کا کوئی ارادہ شامل نہیں تھا۔



گناہ گار کون؟

''انسان کتنا جھوٹ بول سکتا ہے؟''شکیل یہ سوچ کر حیران رہ جاتا۔

یہ حیرت اسے اپنی ذات پر ہوتی تھی کیونکہ وہ روزانہ شازیہ کو اپنی محبت کا یقین دلاتا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بالکل بھی محبت نہیں کرتا۔شازیہ معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔پڑھی لکھی تھی۔امیر باپ کی بیٹی تھی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ شکیل کبھی اس سے شادی نہیں کرے گا،اسے نہایت قیمتی تحائف دیتی رہتی تھی۔کبھی کبھی تو شکیل سوچتا اسکے پاس جو کچھ بھی ہے سب شازیہ کا دیا ہوا ہی ہے۔اس کی وارڈ روب میں تمام پینٹیں اور جتنی شرٹس،ٹی شرٹس،ٹائیاں،کی رنگ یہاں تک کہ بیلٹیں اور پرفیوم بھی شازیہ کے دیئے ہوئے ہی تھے۔

شازیہ سے اس کی ملاقات تین برس پہلے ہوئی تھی وہ اس کے دفتر میں کسی کام سے آئی تھی اور پھر اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔

شکیل کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش ہے جو جنس مخالف کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔وہ درمیانے قد و قامت گندمی رنگت،سیاہ بالوں اور ذہین آنکھوں والا نوجوان تھا جسکی واحد کشش اس کی چھاتی کے ان سیاہ بالوں میں تھی جو اس کی قمیض کے پہلے دو بٹنوں میں سے جھانکتے تھے اور دیکھنے والوں

کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ان بٹنوں پر ٹک جاتی تھیں۔

پہلے پہل اس کو شازیہ میں کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ اس نے کئی بار غور سے اس کو دیکھا مگر وہ اس کی معمولی شکل وصورت میں اپنے لئے کوئی بھی جاذبیت پیدا نہیں کرسکا۔ مگر شازیہ کی اس میں بڑھتی ہوئی دلچسپی، جھکاؤ اور محبت کے بار بار اظہار نے اسے مجبور کردیا کہ وہ بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔

وہ شازیہ سے ملنے جاتا۔ اسکے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اسے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر نہر کنارے گھومتا۔ کبھی کبھی کسی خوبصورت پارک میں بیٹھ کر والہانہ انداز میں اسے دیکھتا رہتا............ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ شازیہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ یا شاید ایسا نہیں تھا.......... اسے صرف شازیہ کی عادت ہو چکی تھی........... محبت اور عادت دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں .... عام طور پر میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے مگر اکٹھے رہتے ہیں کیونکہ انہیں ایک دوسرے کی عادت ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

شازیہ جب بھی اسے ملتی شادی کیلئے اصرار کرتی۔ کیونکہ تمام مشرقی لڑکیوں کی طرح اسکا نظریہ بھی یہی تھا کہ محبت کی معراج شادی ہی ہے۔ محبوب کو ہمیشہ کیلئے پالینا، جسم وجان کا یکجا ہونا........... وہ بھی اپنے محبوب کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا گھر سنبھالنا، اس کے بچے پیدا کرنا اور ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کی خواہشمند تھی ...... مگر شکیل اس بات سے گریزاں تھا........... وہ ابھی شادی کے چکر میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا...... پہلی بات یہ کہ شازیہ میں اس کی آئیڈیل بیوی والی کوئی خصوصیات نہیں

نہیں۔ دوسرے وہ خود کو ابھی معاشی طور پر اتنا مستحکم نہیں سمجھتا تھا کہ شادی جیسی ذمہ داری نبھا سکے.......... اس کے نزدیک شادی کرنے کیلئے اپنا گھر اپنی موٹر کار بہت سارا بینک بیلنس اور ماہانہ معقول آمدنی کا ہونا بہت ضروری تھا........... اسے خدشہ تھا کہ شازیہ جو معاشی طور پر خوشحال ہے اور ناز و نعم میں پلی بڑھی ہے اس کے ساتھ زیادہ دیر نہیں چل سکے گی۔ لہٰذا شازیہ کے استفسار پر کہ وہ اس سے شادی کیوں نہیں کرسکتا۔ اس نے ایک بہانہ بنا رکھا تھا کہ میری ماں اپنی پسند کی بہو لانا چاہتی ہے اور میں اپنی ماں کی خواہش کا پابند ہوں میں اپنی ماں کا دل نہیں توڑ سکتا........... اس کو ناراض نہیں کرسکتا۔

شکیل کے اس انکار کے باوجود شازیہ کے رویئے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کی محبت اور محبت کا اظہار اسی طرح تھا وہ شکیل کو ایک مجازی خدا کی طرح چاہتی اور اس کے لئے شاپنگ کرتی تھی۔ گو شازیہ کی ماں نے اس کیلئے رشتے تلاش کرنا شروع کردیئے تھے اور وہ ذہنی طور پر اس حادثہ کیلئے تیار تھی کہ اسے کسی بھی وقت اپنی ماں کا حکم ماننا پڑے گا۔ اس کے باوجود وہ شکیل کی محبت کو ایک فرض کی طرح نبھا رہی تھی......

اس نے اپنی ماں کا فیصلہ شکیل کو بھی سنا دیا تھا........... اس روز شکیل کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت قیمتی گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا ہے یا اس کی پسندیدہ پتنگ کٹ گئی ہے اور ڈور کا آخری سرا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔ کیا شازیہ چلی جائے گی؟ کسی اور کی ہو جائے گی؟ یہ احساس اسے بے چین کر گیا اسکے پیروں تلے ریت پھسلنے لگی۔ پھر اس نے خود سے سوال کیا۔

کیا میں شازیہ سے محبت کرتا ہوں؟ اس کے اندر سے جواب آیا ''ہاں'' پھر

شازیہ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا؟..........شازیہ ان تین برسوں میں اس کی ملکیت..........اس کی عادت بن چکی تھی اور اپنی ملکیت کو کسی اور کو سونپنا بڑی مشکل بات ہوتی ہے۔ تین برس کی دوستی..........تین برس کی محبت......گو وہ ایک لمحہ کیلئے بھی عشق نہیں بن سکی۔ دونوں طرف دنیاداری تھی مذہب اور معاشرے کا احترام..........سارے بندھن قائم رکھتے ہوئے ایک اٹوٹ بندھن قائم رکھنا......عورتیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں......ماں باپ، رشتہ دار، بہن بھائی سب رشتوں کو تیاگ دیتی ہیں......اور ایک رشتے کو ازلی اور ابدی رشتہ سمجھ لیتی ہیں۔

شوہر کا رشتہ، محبوب کا رشتہ، مجازی خدا کا رشتہ......اور اس رشتے کے آگے تمام رشتے ادھورے اور معمولی ہو جاتے ہیں......جبکہ مرد اپنے تمام رشتوں کو قائم رکھتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار دوست احباب سب رشتے نبھاتا ہے اور سب سے کم اہمیت اس عورت کو دیتا جو اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تن من دھن سب اس پر قربان کر دیتی ہے۔

شازیہ بھی اسی رشتے میں بندھنا چاہتی تھی۔ جو اس کو شکیل کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وابستہ کر دے۔ اس لئے اس نے شکیل کو کبھی اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ اسے خود کو چھونے نہیں دیا......تاکہ وہ اسکا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے چھوڑ نہ دے یا پھر وہ اپنا سب کچھ......اس سہاگ رات کیلئے بچا کر رکھنا چاہتی تھی.......... جو اس نے شکیل کے ساتھ گزارنے کے سپنے دیکھے تھے۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ شکیل کی زندگی میں ایک اور عورت آ گئی.......... رابعہ اس نے غور سے شکیل کو دیکھا......وہ گھبرا گیا......اس نے شکیل کا ہاتھ چھوا تو اس کے

ہاتھ کی گرمی نے اسے پگھلا دیا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' شکیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کچھ بھی نہیں'' رابعہ نے جواب دیا۔

''تم مجھے اچھے لگتے ہو''

''آپ بھی مجھے اچھی لگتی ہیں'' شکیل نے کہا۔

''بس ایک انسان کا دوسرے انسان سے اتنا ہی رشتہ ہوتا ہے یا وہ اچھے لگتے ہیں یا برے۔ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں......لیکن کہتے ہیں بچپن کے بعد اور بڑھاپے سے پہلے سب لوگ ایک ہی عمر کے ہوتے ہیں......تم مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو''

شکیل حیرت میں ڈوب گیا۔ کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ میں شازیہ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے رابعہ اچھی لگتی ہے...... میں دونوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں......ایک شخص ایک وقت میں دو عورتوں سے کیسے محبت کر سکتا ہے۔ شازیہ کی محبت اور اظہار کا طریقہ مختلف تھا۔ رابعہ کا مختلف۔

رابعہ اسے حاصل کرنا چاہتی تھی......اسے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اسے یاد رکھنا چاہتی تھی......جبکہ شازیہ اس کا ساتھ اس کا نام......اس کا تحفظ اور اس کے بچے چاہتی تھی۔ دونوں عورتوں کی خواہشوں میں کتنا فرق تھا!

''اس سے پہلے کہ ہم بچھڑ جائیں......اس سے پہلے کہ آنے والا وقت ہماری زندگی میں تلخیاں گھول دے......ان لمحوں کو امر کر لینا چاہئے تاکہ ان خوشگوار لمحوں کی یادیں......آنے والے اندھیروں میں اجالے بھر دیں...... میں سورج کو دیکھنا چاہتی ہوں......اپنی بانہوں میں بھر کر اس کی کرنیں سمیٹنا چاہتی ہوں......''

اور پھر رابعہ نے سورج کی ساری کرنوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا...... وہ روشنیوں میں نہا کر امر ہوگئی......اس نے محبت کی تکمیل کر لی......اپنے محبوب کو حاصل کرلیا...... لاحاصل محبت کا فائدہ...... انسان جلتا رہے یا سمجھوتے کرتا رہے......سو برس تک جینے مرنے سے ایک دن کی زندگی جی لینا بہتر ہے......اپنی تکمیل...... عشق کی تکمیل اور زندگی کا حاصل......یادیں ہی تو ہیں......خوبصورت یادیں۔

شکیل نے ایک بار پھر سوچا۔ مذہب، سماج، معاشرے۔ گناہ، ثواب جائز، ناجائز، محبت، عشق، ہجر، وصال، سچ کیا ہے؟ کیا جھوٹ ہے؟......اگر جھوٹ بولنا گناہ ہے......تو خود سے جھوٹ بولنا بھی تو گناہ ہے......ہم سب لوگ سماج کی خاطر، مذہب کی خاطر......معاشرے کی خاطر......خود سے جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ خود کو فریب کیوں دیتے ہیں؟

رابعہ نے خود سے سچ بولا ہے......شازیہ خود سے جھوٹ بولتی ہے۔ میں خود سے جھوٹ بولتا ہوں......ہم سب میں گناہ گار کون ہے؟



پانچویں منزل کا آخری کمرہ

جب سے انہیں پولیس نے اطلاع دی تھی کہ دہشت گردوں کی ہٹ لسٹ پر ان کا نام ہے۔ ان کے ذہن میں عجیب سا اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔ نیند تو انہیں پہلے بھی کم آتی تھی۔ مگر اب تو آنکھیں جھپکنا بھول گئے تھے۔ مہربان شاہ اپنے ملک کے مشہور و معروف آدمی تھے۔ معاشرے میں ان کی عزت تھی پہچان تھی اور وہ ایک بڑے حکومتی عہدے پر بھی فائز تھے۔ شاید ان کی یہ عزت یہی پہچان اور ان کا عہدہ ہی ان کا دشمن بن گیا تھا۔ اسی لئے ملک میں تیزی سے پھیلنے والی دہشت گرد تنظیموں نے انہیں اپنی ہٹ لسٹ میں شامل کرلیا تھا۔

دہشت گردوں کا مقصد وطن عزیز میں بے چینی اضطراب اور بدامنی پھیلانا ہی تو تھا اور اپنے اس مقصد کیلئے وہ ملک کے چیدہ چیدہ افراد کو مختلف مقامات پر قتل کر کے مساجد میں نمازیوں پر گولیاں برسا کر یا پھر بھرے بازار میں بم دھماکے کروا کر کافی حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ جو دہشت گرد پکڑے جا چکے تھے انہوں نے اپنی ہٹ لسٹ پولیس کے حوالے کر دی تھی اور اس ہٹ لسٹ میں مہربان شاہ کا نام بھی تھا۔ مہربان شاہ جو جاگیرداروں اور صنعتکاروں کی طرح منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے خیر پور کے ایک گاؤں میں ایک سکول ماسٹر کے گھر آنکھ کھولی تھی۔ ان

کی ماں نے زیور بیچ کرانھیں پڑھایا تھااور وہ اپنی اکلوتی سائیکل پر جسے ان کے والد نے ریٹائرمنٹ کے بعدان کے حوالے کیا تھا۔ یونیورسٹی پڑھنے جاتے تھے۔ ان کے کلاس فیلوان کے معمولی لباس اور پرانی سائیکل کا مذاق اڑاتے مگر وہ ان کے تمسخر کی پروا نہ کرتے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ ایک دن کامیاب انسان بنیں گے اور یہی دوست ان کی عزت کریں گے۔

اور آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب ان کا علم ان کی پہچان بنا اور ملک کی شہرہ آفاق شخصیات میں ان کا شمار ہونے لگا۔ قومی اسمبلی کی رکنیت بھی انہیں مل گئی اور وہ بڑے شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں شاندار بنگلے کے مالک بن گئے۔ دولت اور شہرت کے نشے نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے، ان کے دوست احباب، رشتے دار ان پر رشک کرنے لگے اور جب وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچے تو موت کے سائے انکے گرد منڈلانے لگے۔

''نہیں ......نہیں مجھے ابھی اتنی جلدی نہیں مرنا'' مہربان شاہ نے سوچا اور شہر کے پولیس چیف کو فون کر کے کہا کہ ان کی سیکیورٹی کے انتظامات سخت کر دیئے جائیں۔ اسی روز شام سے ہی ان کے بنگلے کے باہر پولیس کا شامیانہ لگ گیا اور پولیس گارڈ ڈیوٹی دینے لگی۔

گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر ایک مسلح سپاہی ان کے ہمراہ ہوتا ایک پستول ڈرائیور کے پاس بھی ہوتا اور گاڑی کی پچھلی نشست کے نیچے انہوں نے ایک اضافی کلاشنکوف بھی چھپا کر رکھ لی تاکہ اگر کہیں دہشت گردوں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ اس کلاشنکوف کے ذریعے ان کا مقابلہ کرسکیں۔

دوستوں نے مشورہ دیا کہ اب اپنے بنگلے پر رہنا ان کیلئے مناسب نہیں ہے اور انہیں اپنی گاڑی پر سفر بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ دہشت گردوں کو ان کے گھر، گاڑی اور آمدورفت کے اوقات کا پوری طرح علم ہوگا۔ لہٰذا مہربان شاہ نے اپنے قریبی دوست حسن جوان کیلئے جان نثار کرنے کو بھی تیار تھا کی ڈیوٹی لگائی اور جلد ہی شہر میں ایک ہوٹل کی پانچویں منزل کا آخری کمرہ اپنے لئے منتخب کرلیا کیونکہ اس ہوٹل کی لفٹ صرف چوتھی منزل تک جاتی تھی۔ پانچویں منزل پر جانے کیلئے سیڑھی استعمال کرنا پڑتی تھی اور اس منزل پر صرف دو ہی کمرے تھے ایک کمرہ ہوٹل منیجر خود استعمال کرتا اور دوسرا کمرہ اس نے مہربان شاہ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر انہیں رہنے کیلئے دے دیا تھا۔ حالانکہ ہوٹل کے رجسٹر میں اس کمرے کو عابد نامی کسی شخص کے نام لکھا گیا تھا تاکہ دہشت گرد یہاں تک نہ پہنچ سکیں اب گویا مہربان شاہ بالکل محفوظ تھے۔ گھر پر پولیس کا پہرہ تھا، بچے بھی محفوظ تھے اور مہربان شاہ ہوٹل کی پانچویں منزل کے آخری کمرے میں اپنے دوست حسن کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے اور دہشت گردوں کو دھوکہ دینے کی مزید ترکیبیں سوچتے رہتے۔

کبھی کبھی آدھی رات کو جب تقریباً نصف شہر سو چکا ہوتا وہ حسن کے ساتھ اس کی کار پر سیر کیلئے نکلتے۔ گاڑی میں نصرت فتح علی خان کی آواز میں غزلیں سنتے کسی پان والے سے پان خریدتے اور پھر واپس اپنے کمرے میں آجاتے ......اس دوران ان کے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہونے لگی اور وہ خواہش تھی ان تمام لوگوں سے ملنے کی جنہیں وہ اپنی زندگی کی مصروفیات میں بھول گئے تھے......حسن کے ساتھ مل کر وہ اپنے پرانے دوستوں کو یاد کرتے......اپنے ان رشتہ داروں کا ذکر کرتے جنہیں وہ ایک مدت سے

نہیں ملے تھے......اور پھر اپنی محبوبہ کو یاد کرتے جو انہیں زندگی کے ایک حسین اور یادگار موڑ پر اچانک ملی اور غائب ہوگئی...... بالکل ایسے ہی جیسے آسمانی بجلی لمحہ بھر کو چمکتی اور غائب ہو جاتی ہے یا پھر ہلال عید جو ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے اور باوجود کوششوں کے نظر نہیں آتا۔ اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے ہوئے مہربان شاہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور گال کانوں تک گلابی ہو جاتے۔

''حسن میں ایک بار......صرف ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں...... پھر بے شک دہشت گرد مجھے مار ڈالیں'' وہ جذبات میں آ کر کہتے۔

''آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟حسن پریشان ہو جاتا میں آپ کو ملواؤں گا آپ کی محبوبہ سے اور آپ زندہ بھی رہیں گے''۔

حسن میں اسے کیسے مل سکتا ہوں وہ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ ایک مدت سے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہے''۔

''طلب سچی ہو تو منزل خود بخود سامنے آجاتی ہے۔'' حسن مسکراتے ہوئے کہتا۔

اور ایک رات...... جب نصف شہر سو رہا تھا اکا دکا دکانیں کھلی تھیں حسن اور مہربان شاہ ایک پان والے کی دکان سے پان خرید رہے تھے۔ ان کے قریب ایک کار رکی۔ جس میں سے ایک نرم و نازک سی خاتون شانوں پر لہراتے سیاہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے اتری اور ان کے قریب سے گزری......خوشبو کا ایک خوشگوار جھونکا ساری فضا کو معطر کر گیا۔ مہربان شاہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ گال کانوں تک گلابی ہوگئے اور حسن کو سمجھ آگئی کہ یہ وہی ہے جس کا ذکر وہ مہربان شاہ سے روزانہ سنتا ہے۔

چند لمحوں بعد وہ گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی مگر مہربان شاہ اس کے دیدار کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔

''حسن آج میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہوگئی ہے۔ اب مجھے زندگی سے اور کچھ نہیں چاہئے''۔ یہ کہتے ہوئے مہربان شاہ گاڑی کی طرف پلٹے مگر اچانک دائیں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی لوگ ڈر کر بھاگ گئے' حسن دکان کی اوٹ میں ہوگیا......مہربان شاہ خون میں لت پت سڑک پر پڑے تھے......مگر ان کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔



میری گواہی آدھی ہے تو

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہوگا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہوگی

روزی

روزی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے عجیب سی بو اور دھویں کا احساس ہوا۔ ہاسٹل کے اس چھوٹے سے کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ کپڑے، برتن، کتابیں اور سگریٹوں کے ٹکڑے!

میں نے روزی کو آواز دی اور فوراً کمرے سے باہر نکل آئی کیونکہ دھویں اور تمباکو کی بدبو سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بستر پر پڑے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں جنبش ہوئی اور بکھرے بالوں، پریشان چہرے والی نحیف ونزار روزی سامنے کھڑی تھی۔

''روزی چلو نہر پر چلتے ہیں'' میں نے کہا اور جلدی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ دیکھے بغیر کہ روزی نے اپنے کمرے کو تالا لگایا اور چپ چاپ میرے پیچھے چل پڑی۔ اس نے نہ تو منہ ہاتھ دھویا اور نہ ہی اپنے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں اور روزی نہر کے کنارے چل رہی تھیں۔ دونوں

خاموش تھیں۔ دونوں الگ تھلگ مگر پھر بھی ساتھ ساتھ وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی اور میں صرف اس کے بارے میں سوچ رہی تھی، کیونکہ میری کزن صوفیہ نے بتایا تھا کہ صرف دو برس پہلے روزی نہایت خوبصورت تھی۔ کالج کے ہاسٹل میں رہتی تھی 'نہایت اچھا لباس پہنتی تھی اور سفید ساڑھی میں تو بالکل کوئی حور ہی نظر آتی تھی۔ اس کے میک اپ کے انداز، بالوں کے سٹائل اور منفرد لباس کی وجہ سے تمام لڑکیاں اس پر رشک کرتی تھیں۔

ان دنوں روزی اس لئے ہاسٹل میں رہتی تھی کیونکہ اس کے بھائیوں کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ ماں باپ بوڑھے ہوکر کمزور ہو چکے تھے اور کروڑوں کی جائیداد کی نگرانی اور دیکھ بھال اب بھائی کر رہے تھے۔ والد کی بنائی ہوئی وسیع وعرض کوٹھی میں والدین کو انہوں نے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ روزی کو ہاسٹل میں داخل کروا دیا تھا۔ اسے ہر ماہ معقول خرچہ بھیجتے رہتے تھے۔ روزی ہفتے میں ایک بار اپنے والدین سے ملنے گھر جاتی۔ مگر بھائیوں اور بھابھوں کی نظروں میں چھپی نفرت سے گھبرا کر واپس ہاسٹل آجاتی۔

لیکن ان دنوں روزی زندگی سے بھرپور تھی، اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے اور گالوں پر گلابی رنگ جھلکتا تھا۔

اس کے کانوں میں آویزے، گلے میں سونے کی چین اور کلائیوں میں نازک چوڑیاں ہوتی تھیں۔

مگر یہ روزی کتنی مختلف تھی، جینز اور جیکٹ پہننے والی الجھے بالوں، ویران آنکھوں اور زرد رنگت والی۔ اس کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ وہ اتنے سگریٹ کیوں پیتی

ہے؟ اپنے گھر کیوں نہیں جاتی؟ وہ زندگی سے اتنی بیزار کیوں ہے؟

یہ سوالات مجھے پریشان کرتے۔ مگر مجھ میں روزی سے پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ میں کبھی کبھار اسے کمرے سے نکال کر نہر کنارے لے آتی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی اور کئی کئی ہفتوں تک اسے بھول جاتی۔

یونیورسٹی کے دو سال گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ ایم اے فائنل کے امتحان دیتے ہی میری شادی ہوگئی اور میں اپنے سسرال آگئی۔

زندگی کے نئے رنگوں میں مجھے ہاسٹل، سہیلیاں، روزی سبھی کچھ بھول گیا۔

اور.......... پھر ایک دن اچانک میری روزی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ پہلے سے زیادہ ویران ہو چکی تھی۔ اس کے سنہرے بال سفیدی مائل ہو گئے تھے زرد رنگ سانولا ہوگیا تھا اسکے چہرے پر نقاہت اور اس کے وجود میں کمزوری نمایاں تھی .... میں نے اسے ایک نظر دیکھا مگر پہچان نہ سکی۔ دو تین بار غور سے دیکھا تو یاد آیا، یہ روزی ہی تھی۔

روزی کیا ہوا؟ تم یہاں مری میں...... اپنے گھر کیوں نہیں گئی؟

وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوئی مگر پھر اپنائیت کی ایک لہر اس کے چہرے پر ایک لمحہ کیلئے تازگی لے آئی روزی نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے فرح، اس نے آہستگی سے کہا۔

میں روزی کی یہ حالت دیکھ کر دکھی ہوگئی۔

''آج تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ'' میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ روزی کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں اپنے کروڑ پتی باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ دنیا کی ہر آسائش اور آرام میں نے دیکھا۔ جس چیز کی فرمائش کی وہ پائی۔ دنیا میرے لئے جنت سے کم نہ تھی کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اس طرح پل کر میں جوان ہوگئی۔ اس دوران میرے بھائی بھی بڑے ہوگئے...... میری بدنصیبی کی ابتدا اس دن ہوئی جب والد پر فالج کا اٹیک ہوا اور سارا کاروبار بھائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

پہلے انہوں نے مجھے ہاسٹل بھیجا اور ہر ماہ باقاعدگی سے معقول رقم بھیجتے رہے جو میرے اخراجات سے بھی زیادہ تھی......مگر آہستہ آہستہ انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ والد اور والدہ کے انتقال نے مجھے بالکل تنہا کر دیا اور میں سگریٹ اور چرس کے نشے میں خود کو فراموش کرنے لگی۔ میں نے بھائیوں سے جائیداد کا حصہ مانگا تو انہوں نے عدالت میں مجھے ذہنی مریضہ قرار دلوا کر ساری جائیداد پر قبضہ کرلیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ لاکر میں والدہ نے میری شادی کے لئے کچھ زیورات رکھوائے تھے وہ بیچ کر گزارہ کر رہی ہوں۔ 24 گھنٹے میں ایک وقت کا کھانا کھاتی ہوں۔ سگریٹ اس لئے پیتی ہوں کہ یہ اس دنیا میں میرا واحد سہارا ہیں۔ جس دن یہ زیورات ختم ہو جائیں گے میں بھی زہر کھا کر مر جاؤں گی کیونکہ بغیر پیسوں کے نہ تو کسی ہاسٹل میں جگہ ملے گی اور نہ ہی ہوٹل میں...... میرا تو کوئی گھر نہیں ہے جہاں جاسکوں۔

روزی اپنی داستان سنا رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی لوگ اس قدر بے حس بھی ہوتے ہیں۔ خون کے رشتے اس قدر ظالم بھی ہو سکتے ہیں۔ ناز و نعم میں پلنے والی ماں باپ کی لاڈلی روزی اس حالت کو پہنچ گئی ہے میں اس کی کوئی بھی مدد نہ کرسکی اور دل پر ایک بوجھ لے کر چلی آئی۔

زندگی گزرتی رہی ...... میرے بچے بڑے ہو گئے۔ شوہر کو دوسری شادی کا جنون سوار ہوا۔ میں پہلے تو یہ سب مذاق سمجھتی رہی مگر جب پتہ چلا کہ شوہر نے دولت کا لالچ دے کر بچوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ تمام جائیداد اپنے نام کروالی ہے اور ڈاکٹر سے میرے ذہنی مریضہ ہونے کے کاغذات بنوا لئے ہیں تاکہ میری جائیداد، بینک بیلنس اور زیورات پر بھی قبضہ کر سکے۔ رشتوں کا تقدس پامال ہو چکا ہے تو مجھے روزی یاد آ رہی ہے۔ کیا میرا انجام بھی یہی ہے؟ سگریٹ، چرس، دھواں اور بدبودار کمرہ؟



ہر ایک پل کا گھڑی کا حساب دینا پڑا
ہمیں تو زندگی تیرا جواب دینا پڑا
بدن پہ نیل تھے لفظوں کے تازیانوں کے
ہنسی کے ساتھ خوشی کا ہراب دینا پڑا

آسمان سے زمین پر

ناصرہ پر ایک دم وزن کم کرنے کی دھن سوار ہوگئی ...... کبھی کسی سلمنگ سنٹر جاتی۔ کبھی اشتہارات پڑھ پڑھ کر موٹاپا کم کرنے کی ادویات کھانے لگتی۔

سب دوست احباب یہاں تک کہ گھر والے بھی اس کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ ساحرہ نے کئی بار پوچھا۔ ''بھئی یہ وزن کم کرنا اس قدر ضروری کیوں ہوگیا؟ اور پھر تمہارا وزن کوئی زیادہ بھی نہیں ہے۔ قد کے حساب سے بالکل ٹھیک ہے بلکہ دو چار پونڈ زیادہ بھی ہو جائے تب بھی نارمل کہلائے گا''۔

مگر ناصرہ اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی۔

ایک دن ساحرہ نے اکیلے پا کر اسے پکڑ ہی لیا۔

''تمہیں کس نے کہا ہے وزن کم کرو''

''کسی نے بھی نہیں'' ناصرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر یہ دیوانگی کیونکر؟''

"میں کب دیوانی ہوں؟"

"یہ کھانا کم کھانا.........سلمنگ پارلر جانا اور دبلا ہونے کی ادویات استعمال کرنا۔ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے" ساحرہ ٹلنے والی نہیں تھی۔

"بات یہ ہے کہ "I am in love" مجھے محبت ہوگئی ہے" ناصرہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ کس سے.........ہم سے کیوں چھپایا؟" ساحرہ نے پوچھا۔

"مجھے خود بھی معلوم نہیں؟"

"بھلا کیا معلوم نہیں ....یعنی محترمہ عشق فرما رہی ہیں اور معلوم بھی نہیں ....کون خوش نصیب ہیں وہ!.........ارے بھئی ہمیں بھی تو ملواؤ"۔ ساحرہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

"ابھی تک میری ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی" ناصرہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"عجیب عشق ہے جو ملاقات کے بغیر ہی شروع ہوگیا ہے؟"

"ہاں بس ایک بار ان کو دیکھا تھا......ایک محفل میں اور بس"

"اچھا تو آپ کے ان حضرت کو معلوم بھی نہیں ہے کہ شہر کی ایک عدد حسینہ ان کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو چکی ہیں"۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"پھر یہ دبلا ہونے کا چکر کیا ہے؟"

"فٹنس اور سمارٹ ہونے کے لئے دبلا تو ہونا ہی چاہئے ناں"

"اچھا تو یہ ان سے پہلی ملاقات کی تیاری کی جا رہی ہے......چلو اچھا جب آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے تو ہمیں بھی اس حسنِ کامل کی جھلک دکھا کر زیارت کروا دیجئے گا......کچھ ثواب کے حق دار تو ہم بھی ہیں......" ساحرہ نے شرارت سے کہا۔

ناصرہ کے معمولات میں یکدم تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مہندی سے سجاتی۔ درزی سے بحث کر کے نئے ڈیزائن کے کپڑے سلواتی......اور زیورات کی دکانوں پر جا کر مختلف رنگوں کے جدید زیورات پسند کرتی رہتی......بالکل کسی نئی نویلی دلہن کی طرح جس کا کام بس اپنے ساجن کیلئے بننا سنورنا ہوتا ہے......اور وہ زندگی کے آنے والے مسائل سے بالکل بے خبر ہوتی ہے۔

ایک مقامی ہوٹل میں موسیقی کی محفل میں اس نے شیراز کو دیکھا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں، کھلتی ہوئی رنگت اور سیاہ بالوں والا شیراز جس کے چہرے پر ذہانت اور شرافت کا امتزاج اسے نہایت پرکشش بنائے ہوئے تھا۔

شیراز کو دیکھتے ہی اس کو ملنے اسے پانے کی خواہش نہایت شدت سے اس کے دل میں ابھری اور وہ اس خواہش کی تکمیل کے لئے بڑے بھرپور طریقے سے تیاری میں مصروف ہوگئی۔

شیراز اس کی اس کیفیت سے ناآشنا تھا۔ گو پسندیدگی کی ایک لہر اس کے دل میں بھی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔

ایک روز کچھ یوں ہوا کہ ناصرہ کی ایک سہیلی کرن کی شادی تھی......اس کا جانے کو دل تو نہ چاہ رہا تھا مگر چونکہ دوست نہایت قریبی تھی۔ لہٰذا جانا ہی پڑا......اور وہ دن اس کے لئے دنیا کا بہترین دن ثابت ہوا......شادی والے گھر پہنچتے ہی اس کی نظر

گیٹ پر استقبال کیلئے کھڑے شیراز پر پڑی......تب ہی اسے معلوم ہوا کہ شیراز اس کی دوست کرن کا فرسٹ کزن ہے ......شیراز کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا اور خوشی کے یہ رنگ شیراز اور اس کے ساتھ کھڑے سب لوگوں نے دیکھ لئے۔

کمرے میں جاتے ہی ناصرہ نے کرن کے بازو پکڑ لئے......

''کرن مجھے تم سے ایک کام ہے'' کرن اس کی اس حالت پر حیران رہ گئی۔

''کرن وہ جو تمہارا کزن ہے ناں..........شیراز...... مجھے بہت اچھا لگتا ہے''

''اچھا تو یہ بات ہے'' کرن ہنسنے لگی۔

''ہنسنے کی بات نہیں کرن......میں بہت سنجیدہ ہوں''

''ناصرہ اور سنجیدگی......ناممکن......دیکھو میرا کزن نہایت بھولا بھالا ہے......میں تمہیں اس کے معصوم دل سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی تم تو مذاق کر کے چلی جاؤ گی اور وہ بے چارہ دل پر ہاتھ رکھ کر زندگی بھر آہیں بھرتا رہے گا......نا بابا نا......اس بار......تم کسی اور کو نشانہ بناؤ......اس شریف آدمی کو بخش دو۔ کرن ناصرہ کی تمام شرارتوں سے واقف تھی۔

''مگر کرن میں واقعی سنجیدہ ہوں...... مجھے شیراز سے محبت ہوگئی ہے ناصرہ نے اپنی تمام تر سچائی سے کہا۔

''اچھا یہ بات ہے تو میں تمہاری مدد کروں گی'' کرن نے ناصرہ سے وعدہ کرلیا۔

اور پھر گھر پہنچتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''ناصرہ نے فون اٹھایا...... دوسری طرف شیراز تھا۔

''کرن نے مجھے کہا تھا......میں آپ کو فون کرلوں''

ناصرہ کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ زمین، آسمان، سمندر، پہاڑ، دریا، بادل، تتلیاں، جگنو اور دنیا بھر کی تمام تر خوبصورتیاں یکدم سے ساری فضا میں بھر گئیں اور وہ بہت دور کہیں بادلوں میں اڑنے لگی۔

شیراز اس سے ملنے کی خواہش کررہا تھا۔ گویا اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

شیراز نے اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ اس نے آنے کی حامی بھرلی۔ اور دوسرے روز وہ شیراز کے خوبصورت بنگلے کے لان میں بیٹھی تھی۔ کافی کی گرم مہک اور فضا میں کی خنکی کی لہروں سے کئی جھرنے گنگنا رہے تھے......اور ناصرہ اپنے محبوب کو اپنے قریب پاکر اسے دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک کررہی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے بار بار اپنے سراپے کو آئینہ میں دیکھا۔ اپنے جسم کے ہر زاویے پر اسے شیراز کی آنکھوں کی گرمی محسوس ہورہی تھی۔ وہ اسے تمام وقت کتنی گرم نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔ اسے اپنے سراپے میں کوئی کمی نظر نہ آئی۔ اس نے اپنا خواہش کے مطابق مناسب وزن کم کرلیا تھا اور اس پر ہر لباس خوب سجنے لگا تھا۔ شاید اس کے جسم کی یہ موزونیت ہی شیراز کو اس کے قریب لا رہی تھی۔......ناصرہ خود کو دیکھتے ہوئے پہروں اتراتی رہتی۔

ایک روز شیراز اس کے لئے ایک انگوٹھی لے آیا۔ ہیروں کی چمک دم والی انگوٹھی اس کی نازک انگلیوں میں نہیں آرہی تھی۔ اتنی بڑی انگوٹھی شیراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تمام انگلیوں میں باری باری انگوٹھی پہنانے کی کوشش کی مگر بے سود......ناصرہ کی

انگلیاں تو بہت دبلی تھیں۔ لہٰذا انگوٹھی اسے اپنے پرس میں رکھنا پڑی کیونکہ اپنے محبوب کا پہلا تحفہ واپس بھی تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ہر نئی ملاقات شیراز سے اس کی بے تکلفی بڑھاتی گئی...... حسب معمول ہاتھ دیکھنے سے ہاتھ پکڑنے کا آغاز ہوا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے ہونٹوں کو چھونے اور چومنے لگے۔

ناصرہ نہایت شاداں وفرحاں آسمانوں میں کہیں رہنے لگی۔ اس کی ہر خواہش اتنی جلدی پوری ہورہی تھی کہ اس کا دل یقین ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ خواب کی کیفیت میں کیف وسرور کی منازل طے کررہی تھی۔ اس کا لاحاصل عشق حاصل کی منازل کی طرف گامزن تھا۔ وہ ایک دریا کی طرح سمندر میں جذب ہونے کی خواہاں تھی اور اس جزو کی طرف جو اپنے کل سے ملنے کے لئے بے قرار ہو۔ اپنے محبوب کے بازوؤں میں مدہوشی کے عالم میں ان دیکھی لذتوں کے انتظار میں تھی۔

شیراز اسے آہستگی سے اس طرح تھامے رکھتا جیسے وہ کوئی کانچ کی بنی گڑیا ہو جو ذرا سی سختی سے ٹوٹ جائے گی۔

اور پھر ایک خوبصورت شام جب وہ اور شیراز اکیلے تھے۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ خوشبوؤں کی باتیں، پرندوں کی باتیں، آسمانوں کی باتیں، سمندروں کی باتیں اور لفظوں کے ساتھ ساتھ جب دونوں کی سانسیں آپس میں الجھنے لگیں تو دونوں خاموش ہوگئے...... لمحے بولنے لگے...... ہر طرف انجانے گیت ابھرنے لگے۔ شیراز کے ہاتھ اس کے بالوں پر گردن پر چہرے پر اور پھر اسکے جسم کے ہر ہر حصے کو چھونے لگے۔

ناصرہ آنکھیں بند کیے اپنی تکمیل کے لمحے کی خواہش میں اس کے بازوؤں میں مچلتی رہی۔ جسموں کی آواز اور الفاظ آپس میں ہم کلام تھے کہ اچانک یہ تمام سحر ٹوٹ گیا۔ اس کے سپنے کرچی کرچی ہوکر ہر طرف بکھر گئے اس کا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا اور وہ آسمان سے زمین پر آگری۔

حالانکہ کوئی خاص بات نہ ہوئی تھی۔ شیراز نے اس کے کان چومتے ہوئے سرگوشی میں کہا تھا۔

''ناصرہ تمہارے جسم میں تو صرف ہڈیاں ہیں۔ گوشت تو ہے ہی نہیں''



خوفِ مسلسل

کبھی رسوائیوں کا ڈر
کبھی تنہائیوں کا ڈر
کبھی ڈر ہے جدائی کا
کبھی قربت سے دل لرزاں

معذوری یا مجبوری

بہت دنوں کے بعد احسان منزل، میں خوب رونق اور گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ احسان شاہ صاحب، طویل بیماری کے بعد آخر کار وفات پا گئے تھے۔ ان کی سات بیٹیاں، سات داماد دونوں بیٹے، انکی بیویاں اور دیگر عزیز و اقارب ان کی میت کے گرد جمع تھے۔ بقول شاعر!

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ان کی بیوی بڑی سیدانی اپنے رشتہ داروں میں گھری ہوئی تھیں اور محلے کی عورتیں مختلف ٹولیاں بنائے اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ کچھ لوگ حسب معمول مرنے والے کی اچھائیاں اور خوبیاں یاد کر رہے تھے۔

احسان شاہ نہایت نیک، عبادت گذار اور شریف الطبع انسان تھے، نظریں جھکائے گلی سے گذرتے اور گھر میں داخل ہو کر کمرے میں بند ہو جاتے ان کے کمرے میں دو چار پائیاں لوہے کے صندوق اور بہت سارے لکڑی کے شیلف تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ نہایت سادہ زندگی گذارنے والے شاہ صاحب ایک بڑے سرکاری ادارے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے تھے۔ چالیس برس تک افسری کی

تھی مگر افسری کی خو بو نہ آئی تھی۔ رشوت اور مالِ حرام کو چھوا تک نہ تھا۔60 سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر دس سال سرکاری پنشن وصول کر کے ستر برس کی عمر میں دنیا سے سدھارے تھے۔

بڑی سیدانی یعنی بیگم صاحبہ نے مرتے وقت پنشن کے کاغذ پر انگوٹھا بھی لگوا لیا تھا۔ کیونکہ یہی ان کی آخری پونجی تھی۔

جب تک شاہ صاحب ہسپتال میں رہے ان کے ساتوں داماد اور بیٹیاں گھر سے تمام اشیاء اٹھا کر اپنے گھروں میں لے جاتے رہے یہاں تک کہ اب صرف وہ کتابیں باقی بچی تھیں جو شیلفوں میں بہت ساری گرد کی تہوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہ صاحب کی میت آخری سفر پر روانہ ہوگئی اور سب لوگ اپنے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔

شاہ صاحب کی چھوٹی بہو شاہ بانو کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک روز اس نے اپنی ساس سے کتابیں صاف کرنے کی اجازت حاصل کی اور شاہ صاحب کے کمرے میں ان کے شیلف جھاڑنے لگی اس کا خیال تھا کہ ان ڈھیروں کتابوں میں اسے دنیا بھر کا کلاسیکی ادب، تاریخ، شاعری اور مشہور شخصیات کی سوانح عمریاں مل جائیں گی۔ اور وہ ان کتابوں کو پڑھ کر اپنے ذوق کی تسکین کر سکے گی۔

مگر اس کا تجسس حیرت اور مایوسی میں بدل گیا، جب اس نے دیکھا کہ ہر کتاب جنسیات کے موضوع پر ہے اور جنسیات کے ہر مضمون اور پہلو پر کتاب موجود ہے۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ وہ شاہ صاحب جو عبادت گذار، شریف، دیانتدار، نہایت باکردار انسان کے طور پر مشہور تھے۔ ان کے ساتھ کام

کرنے والے، محلے دار، رشتہ داران کی شرم و حیاء کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ ساری زندگی اس قسم کی کتابیں پڑھتے رہے تھے۔

بہرحال شاہ بانو نے اپنی ساس سے کہا کہ یہ کتابیں اس کے کام کی نہیں اور نہ ہی کسی لائبریری کو دی جاسکتی ہیں۔ بہتر ہے کہ کسی ردی والے کو بلا کر فروخت کر دی جائیں۔

کتابیں فروخت کردی گئیں۔ مگر شاہ بانو بہت دنوں تک پریشان رہی۔ کیونکہ زمانہ طالب علمی میں ہی اس کی شادی ہوگئی تھی، اور شادی کے بعد اس نے اردو ادبیات میں ایم۔ اے کیا تھا۔ شادی چونکہ ایک دین دار گھرانے میں ہوئی تھی۔ ساس اور نندیں باپردہ تھیں باقاعدہ برقع اوڑھتیں، نماز، روزے کی پابندی کرتیں۔ لیکن ایک مرتبہ پہلے بھی وہ ایسی ہی حیرت زدہ ہوئی تھی، جب صبح ناشتہ کرتے ہوئے باورچی خانہ میں اس کی ساس نے اسے ایک کتاب پڑھنے کے لئے دی تھی کتاب کا نام تھا ''کوک شاستر''۔ کتاب پڑھتے ہوئے وہ کبھی اپنی ساس کے بارے میں سوچتی اور کبھی اس کتاب کے مندرجات پر غور کرتی، اور اس نے اپنی اس حیرت کو اس سوچ کے ساتھ بدل لیا، شاید اس کی ساس اسے وہ باتیں سمجھانا چاہتی تھی، جو وہ نہیں کہہ سکتی تھی۔

دن گذرتے گئے شاہ بانو کے تین بچے ہوگئے۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ دن رات اس کے اردگرد منڈلاتا رہتا اور اس کی ذرا سی جدائی یا لاپرواہی برداشت نہیں کرتا تھا۔ شاہ بانو اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ مگن ہو کر ساری دنیا کو بھول چکی تھی۔ یہی اس کے معمولات تھے۔ یہی اس کی زندگی تھی۔ اس کا گھر ہی

اس کی جنت تھا۔ مگر اس جنت کو شاید کسی کی نظر لگ گئی اس کے شوہر نے جنسی رسالے پڑھنا، تصویریں دیکھنا اور فلمیں دیکھنا شروع کر دیا، اور آہستہ آہستہ اس سے دور ہونے لگا۔ گھر سے باہر وقت گذارنا اس کا معمول بنتا جا رہا تھا اور پھر اس نے راتیں بھی گھر سے باہر گذارنا شروع کر دیں۔

شاہ بانو اس صورتحال سے پریشان ہوگئی، گھر میں ویرانی اور بے چینی کی فضا پیدا ہوگئی۔ چھوٹے شاہ صاحب نے گھر کے اخراجات دینے بند کر دیئے بچے ڈرے اور سہمے رہنے لگے۔

شاہ بانو جب انہیں دیر سے آنے کی وجہ پوچھتی تو گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، مار پیٹ، چیزیں توڑنے، بچوں کو ڈانٹنے کے ساتھ ساتھ گالی گلوچ کا طوفان برپا ہوتا۔

شاہ بانو جو پڑھی لکھی تھی ہر طرح کے حالات کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ صورت حال اس کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے شاہ جی کے دوستوں سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کا کچھ غلط قسم کی عورتوں کے ہاں آنا جانا ہے۔ اور وہ اکثر ان کے ساتھ گھومتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تبدیلی کیوں آئی اور کیسے آئی؟ یہ بات شاہ بانو کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ کیونکہ وہ شاہ صاحب جو نوجوانی میں ہر وقت ان کا پائنچہ پکڑ کر بیٹھے رہتے تھے پچاس سال کی عمر میں دوسرے گھروں کی دہلیزوں پر کیسے جا بیٹھے تھے۔

ایک شام شاہ صاحب خلافِ معمول جلدی گھر آ گئے، موڈ بھی کچھ اچھا ہی تھا۔ شاہ بانو ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے شاہ بانو کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے گلے سے لگایا۔ اور پھر کچھ سوچ کر

اٹھے اور باتھ روم میں چلے گئے۔

شاہ بانو کے لئے یہ سب کچھ بہت اچانک تھا۔ اس نے اٹھ کو خود کر سنبھالا تو اس کی نظر باتھ روم کے کھلے دروازے کی طرف گئی۔

چھوٹے شاہ جی کے ہاتھ میں دوائی کی ایک شیشی تھی جسے دیکھ کر شاہ بانو ایک بار حیران رہ گئی اس کا وہ تمام غصہ اور کدورت جو چھوٹے شاہ جی کے لئے تھا ختم ہو گیا۔ اور اسے ان پر ترس آ گیا۔ جیسے ایک چھوٹے بچے یا بیمار پر ترس آتا ہے۔ جو چل پھر نہیں سکتا لیکن اپنی اس معذوری کو کسی پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا۔



کاش وہ روزِ حشر بھی آئے

کاش وہ روزِ حشر بھی آئے
ساری دنیا پتھر لے کر
جب مجھ کو سنگسار کرے
تو اپنی بانہوں میں چھپا کر
پھر بھی مجھ کو پیار کرے

راون کی قید میں

اسلام آباد کی آب پارہ مارکیٹ سے شاپنگ کر کے شکر پڑیاں گلاب اور چنبیلی کے باغ میں گھومتے ہوئے جب ہم تھک گئے تو واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر چیزوں کے لفافے اور ٹوکریاں اٹھائے چند قدم ہی چلے تھے کہ پیاس تنگ کرنے لگی۔ مارچ کے اواخر میں موسم ایکدم بدل چکا تھا۔ ہوا کی خنکی گرمی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس لئے دھوپ کی شدت نے پیاس کو چمکا دیا۔ مگر بازار ابھی بہت دور تھا اور سڑک تک پہنچنے کے لئے کافی فاصلہ تھا۔ قریب ہی ایک کالے رنگ کا گیٹ تھا۔ ہم نے سوچا کیوں نہ یہاں سے پانی طلب کیا جائے۔ یہ سوچ کر گیٹ کی طرف چل دیئے۔

''آپ کس سے ملنے آئی ہیں؟''

ایک سانولا سلونا قد آور صحتمند نوجوان گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں پیشانی پر بکھرے گھنگھریالے بالوں والا .... وہ لڑکا نہایت ہی وجیہہ لگا۔ اس نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں پیاز تھا۔

''ہمیں پیاس لگی ہے پینے کیلئے پانی چاہئے'' میں نے کہا۔

''آپ لوگ اندر آ جائیں'' یہ کہہ کر وہ ہمارا رہنما بن گیا اور ہم اس کے پیچھے چل

دیئے۔ ''یہ یوتھ ہاسٹل ہے'' اس نے چلتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ سری لنکا سے آئے ہیں۔ آپ نے سری لنکا کا نام سنا ہے''

''جی ہاں.......... وہی سری لنکا جہاں راون نے سیتا کو قید رکھا تھا''

''ارے آپ تو جانتی ہیں۔ وہ نہایت بے باکی سے ہنسا اور اس کے سانولے چہرے پر موتیوں سے دانت چمک اٹھے۔

''آپ ٹھہریں میں ابھی پانی لاتا ہوں'' ایک سایہ دار درخت کے پاس رک کر اس نے کہا اور خود عمارت میں داخل ہو گیا۔

''یہ تو بہت اچھی اردو بولتا ہے'' سمیرا نے کہا۔

''خوبصورت بھی تو بلا کا ہے'' شاہدہ بولی۔

اتنا وجیہہ اور صحتمند انسان میں نے بھی پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ اتنے میں وہ پانی لے کر آ گیا۔

''اس کے ہاتھ کا پانی مت پییں یہ کافر ہے''

میں نے اس آواز پر پلٹ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت جو اپنے لباس اور شکل وصورت سے ایرانی لگتی تھی۔ برآمدے میں بیٹھی ہم سے مخاطب تھی۔ ایک لمحہ کیلئے ہم نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کافر کی طرف دیکھا جس کے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔ اور جو آنکھوں میں خلوص کی چمک لئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ بدھا کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟''

اس نے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''انسانیت کے اس پیامبر کو کون نہیں جانتا'' میں نے کہا اور اس کے چہرے پر

مندی کا احساس بکھر گیا۔

''آپ کچھ دیر یہاں رک جائیں'' اس نے التجا کی۔

''کیوں؟''

''بہت دنوں سے کوئی بات کرنے والا نہیں ملا''

''کیا مطلب؟''

''آپ کے ملک کے لوگ ہم سے زیادہ بات نہیں کرتے''

''کیوں.......... کیا آپ کو راون سمجھتے ہیں؟''

''شاید''

''لیکن ایسا نہیں ہو سکتا'' میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟'' اس نے پوچھا۔ مگر میں جواب نہ دے سکی کیونکہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر راون اتنا خوبصورت ہوتا.......... تو شاید سیتا کبھی واپس نہ آتی۔

''میں بدھ کا پیروکار ہوں''

''میں بدھ سے محبت کرتی ہوں''

''کیا آپ مسلم نہیں ہیں؟'' بڑی بڑی آنکھیں حیران ہو گئیں۔

''ہوں''

''پھر کیونکر؟''

''اس لئے کہ میں انسان بھی ہوں''

''اچھا..........'' اس نے پھر بے باکی سے قہقہہ لگایا۔ اس کے چہرے پر بجلی سی چمک گئی۔

"آپ نے پانی نہیں پیا" اس نے گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں بھول ہوگئی" میں نے گلاس تھام لیا۔

ایرانی عورت نے غصے سے مجھے گھورا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

میں نے پانی پی لیا۔ باقی لڑکیاں بھی باری باری پانی پینے لگیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے سدھارتھ نروان حاصل کر کے جنگل سے واپس آ گیا ہے اور باری باری سب کو روشنی بانٹ رہا ہے۔

"آپ کبھی سری لنکا آئیں"

خالی جگ اور گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے کہا اور زمین پر چٹائی بچھا دی۔ ہم اس کے قریب بیٹھ گئے۔

جیسے بدھا سے اس کی تعلیمات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

"سری لنکا کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"یہی کہ وہ مسز بندرانائیکے کا دیس ہے" شاہدہ نے کہا۔

جہاں حوا اور آدم نے جنت سے نکلنے کے بعد محبت کی تھی۔ جہاں راون کی قید میں سیتا نے دن رات رام کو پکارا تھا۔ جہاں ظلم اور محبت کی جنگ میں محبت کی جیت ہوئی تھی اور شری رام کو فتح ملی تھی۔ سری لنکا........ جہاں سدھارتھ نے یشودھرا کو زندگی اور حسن سے بھرپور کئی راتیں دے کر اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ انسانوں کے لئے سکھ ڈھونڈنے کیلئے اپنے سکھ اور گھر بار کو تیاگ دیا تھا۔ میں اس دیس کو ضرور دیکھوں گی جہاں محبت جیتتی ہے اور ظلم ہارتا ہے۔ جہاں کے راجہ عوام کے سکھ کیلئے اپنی ساری خوشیاں لٹا کر جنگلوں میں چلے جاتے ہیں۔ میں خواب ناک سی کیفیت میں ڈوبی

جانے کیا کچھ سوچتی رہی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ کو میرا ملک پسند نہیں ہے؟" وہ ایک دم مجھ سے مخاطب ہوا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں...... آپ کا ملک بہت حسین ہے۔ حسن اور محبت کی سرزمین ہے۔ میں اسے ضرور دیکھوں گی"

"اب ہمیں چلنا چاہئے" فرناز نے کہا اور سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا خدا حافظ" میں نے اسے کہا اور وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

"میرا نام چنت تلک رتنا ہے"

"اچھا نام ہے.......... آپ بھی بہت اچھے ہیں"

وہ پھر ہنسا۔ میں نے سفید دانتوں کی چمکتی بجلیاں دیکھیں۔ وہ دروازے تک چھوڑنے آیا۔

"خدا حافظ"

"خدا حافظ چنت تلک رتنا" ہم نے بیک آواز کہا۔ آخری بار اسے دیکھتے ہوئے سڑک کی طرف چل دیئے۔ میرے ساتھ والی لڑکیاں بہت خوش تھیں اور اپنے اپنے الفاظ میں سری لنکا اور چنت تلک رتنا کو سراہ رہی تھیں۔

میں خاموش تھی.......... جیسے دل پر کوئی بوجھ سا ہو، جیسے میں کہیں کھوئی ہوئی تھی... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے راون نے مجھے قید کر لیا ہے۔



اسے توستر حوریں ملیں گی

اسے توستر حوریں ملیں گی
میں تنہا رہ جاؤں گی
اللہ تیری اس جنت میں
میں تو کبھی نہ جاؤں گی

ٹھنڈی عورت

نغمہ کی شادی کو ابھی چار دن ہی ہوئے تھے کہ اس کے شوہر جمال نے اپنے سابقہ معاشقوں کے قصے اپنی محبوباؤں کے جسمانی خدوخال کی تفصیلات کے مطابق سنانا شروع کر دیئے۔

بیتے لمحوں کی داستانیں وہ تمام جزئیات کے ساتھ یوں بیان کرتا گویا اس نے بڑی محنت سے ہر موضوع پر لیکچر تیار کر رکھا ہو اور اسے ڈر ہو کہ کوئی پوائنٹ مس ہو گیا تو اس کے نمبر کٹ جائیں گے۔

نغمہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہتی اور جمال کے ہاتھ اس کے سراپے پر رینگنے لگتے۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ جلدی سے یہ ہاتھ جھٹک دے کیونکہ ان ہاتھوں کے لمس سے اسے کراہت سی محسوس ہوتی۔ اسکا ذہن اس کے جسم کا ساتھ نہ دیتا اور وہ اپنے آپ کو سپردگی کیلئے تیار نہ کر پاتی۔

جمال حسب دستور اس کے ہر ہر خدوخال کو چھوتے ہوئے اپنی کسی نہ کسی سابقہ

محبوبہ کی تعریفوں میں زمین اور آسمان سمو دیتا اور اسے اپنی طرف متوجہ نہ پا کر جھنجھلا اٹھتا۔

”تم تو بالکل ٹھنڈی عورت ہو“

نغمہ کو اپنے جسم کے اندر برف کی سلوں جیسی ٹھنڈک کا احساس ہوتا اور وہ محض اس خیال سے جمال کے پہلو میں لیٹی رہتی کہ اسے مذہبی اور قانونی فریضہ ادا کرنا ہے۔

فرض کی ادائیگی اگر خوشی سے کی جائے تو وہ باعث سکون وطمانیت ہوتا اور اگر مجبوری کی طرح فرض نبھایا جائے تو وہ ذہنی الجھنوں میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

لہٰذا اس کی ذہنی الجھنیں بڑھتی گئیں۔

حالانکہ اسکے گھر میں اور بہت سی عورتیں تھیں۔ ساٹھ سالہ ساس جو شادی کے چالیس سال گزارنے کے بعد بھی اپنے شوہر کے رات کو پاس بلانے کا اعلان کرتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھتی گھر میں جتنے کمرے تھے سب میں اس کی نندیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ براجمان تھیں اور چونکہ سب کے پاس شادی شدہ ہونے کا سرٹیفکیٹ یعنی لائسنس موجود تھا۔ لہٰذا جب جس کا جی چاہتا کمرے کے اندر کنڈی چڑھا لیتا۔

اس کا بھی جی چاہتا کہ وہ اپنے شوہر جمال سے لپٹ جائے اور خوب پیار کرے۔ جمال اس کا شوہر ہی نہیں محبوب بھی تھا۔ اس نے اسے پانے کیلئے ہزاروں دعائیں مانگی تھیں اور جب وہ اس کے ہاتھ میں نکاح کی انگوٹھی پہنا رہا تھا تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھی۔ مگر جمال کے کمرے میں آتے ہی نجانے

کہاں سے کوئی زرینہ، فریحہ یا غزل بھی ساتھ ہی کمرے میں آجاتیں اور اپنے جسم کے ان حصوں کی نمائش کرنے لگتیں جن کی تعریفیں کرتے ہوئے جمال کسی انجانی دنیا میں پہنچ جاتا تھا۔ سردی کی لہریں نغمہ کے جسم کے اندر دوڑنے لگتیں اور وہ بالکل بے حس وحرکت بستر پر پڑی رہتی۔ جمال کے وجود کی گرمی بھی اس برف کو نہ پگھلا سکتی اور وہ جھنجھلا کر کہتا۔ ”تم تو بالکل ٹھنڈی عورت ہو“

دن مہینوں اور پھر سالوں میں بدلنے لگے۔ اس کے آنگن میں دو پیارے پیارے بچے عرفان اور نعمان کھیلنے لگے۔ وہ بچوں اور گھرداری میں مصروف ہوگئی۔ جمال کی گھر سے باہر مصروفیات بڑھنے لگیں اور پھر اس نے راتوں کو دیر سے آنا شروع کر دیا۔ نغمہ کے احتجاج پر جواب ملتا ”تمہیں کیا فرق پڑتا ہے تم بچوں کے ساتھ جلدی سو جاتی ہو۔ میں گھر رہوں یا باہر تمہارا کیا بگڑتا ہے“

آدھی رات سے بڑھ کر جمال کے آنے کا وقت صبح پانچ چھ بجے تک پہنچ گیا۔ نغمہ کے احتجاج پر لڑنا جھگڑنا اور مار پیٹ کرنا جمال کا معمول بن گیا اور اس نے ٹھنڈی عورت کے کمرے سے اپنا بستر بھی ہٹا لیا۔ کیونکہ اس کی کاروباری مصرفیات بڑھ چکی تھیں اور رات بھر اس کے کاروباری ٹیلیفون آنا ہوتے تھے۔

بچے گھر کے اس ماحول سے خوفزدہ رہنے لگے۔ باپ جب بھی گھر آتا وہ سہمے رہتے کہ ابھی کوئی ہنگامہ ہوگا۔

آخر کار نغمہ نے جمال کو پوچھنا چھوڑ دیا۔ وہ اس کے کمرے کی طرف بھی نہ جاتی اور یوں دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کرتے۔ جمال کو کھانا اور ناشتہ وغیرہ دینا نوکرانی کے ذمہ تھا۔ نغمہ اس سے بالکل ہی بے تعلق سی ہوگئی۔

اور پھر ایک دن اچانک حیدر علی نغمہ کی زندگی میں چلا آیا۔ نغمہ کی سہیلی شہلا کے بھائی کی شادی تھی اور اسکا دوست حیدر علی اسلام آباد سے شادی میں شرکت کے لئے آیا تھا۔

حیدر علی مردانہ وجاہت کا بھرپور شاہکار تھا۔ لمبا قد، کھلتا ہوا رنگ، بڑی سیاہ آنکھیں اور بالوں میں چمکتے ہوئے تھوڑے سے چاندی کے تار۔ جو اسکے وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔

نغمہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ بھی اس کے قریب آ گیا۔ بہت ساری باتیں کرتا رہا۔ اس کے لہجے کی اپنائیت آواز کی گرمی اور ذہانت سے وہ اس کی گرویدہ ہوگئی۔

پھر یوں ہوا کہ وہ فرصت ملتے ہی بہانے بہانے شہلا کے گھر جا پہنچتی۔ ''بھئی طارق بھائی کے دوست کہاں ہیں؟''

اور شہلا بھی حیدر علی کے آتے ہی اسے بلا لیتی۔

شام کی چائے اور دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوتی۔ باتیں ہوتیں اور نغمہ ایک سکون اور طمانیت کا احساس لئے گھر آ جاتی۔

اس کے چہرے کی پژمردگی ختم ہونے لگی اور آپ ہی آپ ایک مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر سج گئی۔ ایک نیا سرور اس کے وجود پر گیا اور اسے احساس ہوا جیسے اس نے دوبارہ زندگی سے دوستی کر لی ہے۔

ورنہ وہ تو کبھی کی مردہ ہو چکی تھی اور بے دلی سے زندگی گزار رہی تھی۔ اسکو ہر وقت ہر لمحہ حیدر علی کا انتظار رہنے لگا اور وہ اس کی آمد کے لئے اپنے کپڑوں اور میک

اپ پر بھی توجہ دینے لگی۔

اور پھر وہ دن آیا جب شہلا کے گھر حیدر علی اور وہ بالکل ہی اکیلے تھے۔ حیدر علی صوفے پر اس کے قریب آ گیا۔ دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے اس نے آہستگی سے نغمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ نغمہ کے جسم میں انگارے بھر گئے۔

حیدر علی نے اس کے بالوں کو، گالوں کو گردن کو آہستہ آہستہ چھوا اور وہ آپ ہی آپ اس کے چوڑے چکلے سینے میں دھنستی چلی گئی۔ اس کی تیز ہوتی سانسوں اور جلتے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے حیدر علی نے سرگوشی کی۔

''تم تو بہت گرم ہو۔ تمہارے اندر اتنی گرمی، اتنا لاوا ہے میں نے تو سوچا بھی نہ تھا۔



مجھے دعا دو!

مجھے دعا دو!
میری بصارت تمہاری صورت سے جگمگائے
میری سماعت تمہارے لفظوں سے گنگنائے
مجھے دعا دو!
میں جب بھی سوچوں تمہیں ہی سوچوں
میں جب بھی دیکھوں تمہیں ہی دیکھوں
مجھے دعا دو!
میں جب بھی بولوں تو نام تیرا زباں پہ آئے
جو چھونا چاہوں تو لمس تیرا مجھے جگائے
مجھے دعا دو!
تمام جیون تمہاری بانہوں میں بیت جائے
تمہارے قدموں میں سر کو رکھوں تو موت آئے

انس+محبت+عشق

مسئلہ زیر بحث تھا۔
انس کیا چیز ہے؟
محبت کسے کہتے ہیں؟
عشق کس منزل کا نام ہے؟

نصرت کا خیال تھا کہ انسان جہاں رہتا ہے، وہ اپنے اردگرد کے ماحول، اپنے اطراف میں بسنے والے لوگوں اور تمام اشیاء خواہ وہ جان دار ہوں یا بے جان۔۔۔غیر شعوری طور پر ان سے انس کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی پسندیدہ کتاب جسے آپ اپنے کسی عزیز دوست کو بھی نہ دے سکیں، آپ اس سے انس رکھتے ہیں۔

وہ کمرہ جہاں آپ زیادہ وقت گذارتے ہیں، اس سے آپ کو انس ہو جاتا ہے۔
وہ لوگ جن کی غیر موجودگی میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے، ماں باپ کی اولاد سے محبت، اولاد کی والدین سے محبت، بہن بھائیوں کی محبت، رشتہ داروں کی محبت اور دوستوں سے محبت۔۔۔ہم سب لاشعوری طور پر بہت ساری محبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور ان سے نکل نہیں سکتے۔

عشق صرف محبوب سے ہو سکتا ہے۔۔۔محبوب کا تصور ایسی طاقتور شخصیت کا

ہے، کہ آپ جس کے مکمل حصار میں چلے جاتے ہیں، اور اپنے آپ کو ذہنی وجسمانی طور پر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ عشق یا تو خدا کی ذات سے ہوتا ہے، کسی روحانی پیشوا سے ہوتا ہے، یا پھر زندگی میں ملنے والی بھر پور شخصیت جو آپ کو اپنے حصار میں لے کر دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے، آپ پھر اس مقام تک نہ تو کسی اور کے ساتھ جا سکتے ہیں نہ اپنے خیالات وجذبات کسی پر ظاہر کر سکتے ہیں۔ اظہار اور کلام کی حدیں ختم ہو کر صرف محسوسات کی دنیا باقی رہ جاتی ہے۔ صرف اسی منزل کو عشق کہا جا سکتا ہے، عشق ذاتِ الٰہی کی طرح لاشریک ہے۔ اس میں آپ اپنے محبوب کے علاوہ اور کسی کو شریک نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ایسی منزل ہے ایسا مقام ہے جہاں پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

سجاد کو نصرت سے اختلاف تھا، اس کا کہنا تھا کہ انسان صرف انس کر سکتا ہے۔ محبت اور عشق نہیں، یہ دو اوصاف اللہ تعالیٰ نے انسان کو ودیعت ہی نہیں کیے، کیونکہ وہ اتنا بڑا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکتا، محبت ایک مشکل کام ہے، ایک کٹھن راہ پر چلنے کا نام ہے، جبکہ مقامِ عشق تو بالکل نادیدہ ہے۔

ہم محبت اور عشق کے صرف ناموں سے آشنا ہوتے ہیں، جذبوں سے نہیں، انس کو ہم محبت سمجھتے ہیں، ہمیں اپنے دوستوں سے، ملنے والوں سے، عزیزوں رشتہ داروں سے اور سب پسندیدہ چیزوں سے انسیت ہوتی ہے۔ ہم مخالف جنس کے افراد سے بھی انس رکھتے ہیں، محبت نہیں کرتے، جانوروں سے صرف ہمدردی ہوتی ہے، اسے انس نہیں کہا جا سکتا۔

”تم بالکل بور انسان ہو۔۔۔ بے حس“ نصرت جھنجلا جاتی،

”ایسا ہی ہوں“

”تو پھر مجھ سے کیوں ملتے ہو؟

”تم مجھے اچھی لگتی ہو“

”اور کچھ نہیں“

”بالکل نہیں“

”تمہیں مجھ سے انس ہے“

”میں ایسا بھی نہیں سمجھتا، کیونکہ تمہاری غیر موجودگی میں۔۔۔ میں تمہیں یاد نہیں کرتا، تمہاری کمی محسوس نہیں کرتا“

لیکن میں تو بہت ساری چیزوں کے انس میں مبتلا ہوں۔ دیکھو نا، مجھے اپنے لان کے سب پودے اچھے لگتے ہیں۔ جب کوئی پھول مرجھاتا ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔۔۔ میری بلی مجھے دکھائی نہیں دیتی تو میں اسے ڈھونڈنے لگتی ہوں۔۔۔ میری کتیا کا بچہ مر گیا تھا، تو بہت دنوں تک میرے ذہن پر عجیب سی اداسی چھائی رہی تھی، میری پسندیدہ کتاب میرے ایک کلاس فیلو نے چرالی تھی۔ میں نے اس کتاب کو ابھی تک فراموش نہیں کیا۔ اور چرانے والے کو آج بھی معاف نہیں کیا۔ میں جس گھر میں رہتی ہوں اس سے دور نہیں رہ سکتی، یہاں تک کہ میں اپنے شہر سے زیادہ دن باہر نہیں رہ سکتی، میں دیواروں اور درختوں کے انس میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ اور انسان تو پھر چیزوں اور جانوروں سے افضل ہوتے ہیں، لہذا اان کے لئے میرے جو جذبات ہوتے ہیں، انہیں انسیت سے اگلا درجہ دیا جا سکتا۔ جسے محبت کہتے ہیں، میں سب سے محبت کرتی ہوں، اپنے والدین سے، بہن بھائیوں سے دوستوں سے، اپنے ساتھ کام

کرنے والوں سے، میں ان سب کے لئے اداس رہتی ہوں، غیر موجودگی میں ان کی کمی محسوس کرتی ہوں، اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب کی محبت میں مبتلا رہتی ہوں، میرا خیال ہے کہ میں تم سے بھی محبت کرتی ہوں۔۔۔ کیونکہ میں تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری کمی محسوس کرتی ہوں۔ تنہائی کے لمحوں میں مجھے تمہارا خیال آتا ہے، خوبصورت موسم، بارش اور چاندنی راتوں میں میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم سے بہت ساری باتیں کروں۔

کیا یہ محبت نہیں ہے؟

''نہیں یہ صرف انس ہے، اور اس وقت تک ہے جب تک ہم اکٹھے ہیں، ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں، جب ہم الگ ہو جائیں گے، یا ہمارے راستے جدا ہوں گے کچھ دن اداسی رہے گی، پھر سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔۔۔۔ ہم دونوں اپنی مصروفیات میں ایک دوسرے کو بھول جائیں گے،،

سجاد اپنے فلسفے پر قائم تھا۔

''وقت تو ہر زخم کا مرہم ہے، نارمل تو ہم اپنے عزیزوں کے مر جانے کے کچھ عرصہ بعد بھی ہو جاتے ہیں، مگر کیا زندگی بھر ان کو بھلا سکتے ہیں؟ نصرت بھی ہارنے والی نہیں تھی۔ سجاد اور نصرت ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے، اور دفتری کاموں سے فارغ ہو کر وہ مختلف بحثوں میں الجھ جاتے اور پھر اپنے اپنے فلسفے ادھورے چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔''

دن یونہی گذرتے رہے، کئی رتیں، کئی موسم بدلے اور پھر ایک دن نصرت کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا، نصرت خوش تھی، کیونکہ تبادلے کے ساتھ اس کی ترقی بھی ہو گئی

تھی، مگر اس کی فطری اداسی نے اسے پریشان کر دیا تھا، وہ دفتر میں چارج چھوڑتے وقت اپنے دفتر کی ہر کھڑکی اور دروازے کو چھو کر الوداع کہتی رہی، اس نے ہر پھول، پتے گملے اور دفتر کے ہر اہلکار کو خدا حافظ کہا۔

سجاد کے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ٹشو پیپر میں وہ آنسو جذب کر لئے جو آپ ہی آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں چلے آئے تھے۔

''خدا حافظ''

''خدا حافظ نصرت۔۔۔۔ ہم نے اچھا وقت گذارا ہے، امید ہے تمہارا نیا دفتر اور نیا شہر بھی تمہیں راس آئے گا، اور تم جلد ہی اس جگہ کو بھول جاؤ گی'' سجاد نے روایتی بے حسی سے کہا۔

''ممکن ہے ایسا ہی ہو'' نصرت جلدی سے واپس آ گئی، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سجاد اس کی آنکھوں کے آنسو دیکھ سکے۔

نیا دفتر، نیا ماحول اور نیا شہر واقعی بہت اچھا تھا۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر نصرت کا باس شجاع بہت زندہ دل شخص تھا۔ ہر وقت خوش رہنے والا اور دوسروں کو ہنسانے والا، نصرت کا دل بھی لگ گیا، اور وہ پرانے دفتر، پرانے ساتھیوں اور دوستوں کو بھول ہی گئی، شجاع اس کے قریب آتا گیا، وہ اس کی باتوں، اس کی موجودگی سے لطف اندوز ہونے لگی، اس کو محسوس ہوتا کہ اس سے پہلے اس نے جتنی زندگی گذاری تھی، وہ نہایت بور تھی، پرانے دفتر کا سنجیدہ ماحول اور سجاد کی فلسفیانہ باتیں، جو اس وقت اس کا بہترین سہارا تھیں، اب بالکل فضول اور بور محسوس ہوتی تھیں۔۔۔۔ اس نے اب ان سب کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

کبھی تنہائی میں اسے سجاد کا خیال آتا تو وہ سوچتی محبت جیسا خوبصورت اور پاکیزہ جذبہ کسی بے حس انسان سے مغز کھپانے یا ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتا، محبت کے قابل صرف زندگی سے ہر لمحہ لطف اندوز ہونے والے، ہنسنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کو بھی زندگی سے پیار کرنا سکھا دیتے ہیں۔

نصرت آہستہ آہستہ شجاع کی محبت میں مبتلا ہوتی گئی، وہ ہر وقت ہر جگہ اسے سوچنے اور محسوس کرنے لگی،

ایک عجیب سا ان دیکھا نشہ اس کے وجود پر چھا گیا، اور اس کا دل اور روح ایک نئے کیف، ایک نئے سرور سے آشنا ہوئی،

نصرت بہت خوش تھی، آسمان اس کے قریب اور زمین اس کے قدموں کے نیچے تھی، سورج، چاند، ستارے، بارش، پھول، درخت سب اس کے دوست تھے، ہم راز تھے، ہم زباں تھے۔۔۔ وہ شجاع کی محبت میں سرشار تھی۔۔۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ کسی کو شدت سے چاہنا اور کسی کو اپنا سمجھنا کتنی خوبصورت بات ہے۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ سجاد کو جا کر بتائے۔

''آؤ دیکھو محبت اس کو کہتے ہیں، زندگی کا حسن ہی محبت کی دین ہے، ورنہ زندگی بالکل بے رنگ ہے، بے باس ہے، زندگی میں رنگ اور خوشبو محبت کے وجود سے بھرتے ہیں اور زندہ رہنے کا اصل مقصد کسی سے محبت کرنا ہی ہے''

مگر سجاد لاہور میں تھا، اور وہ یہ سب اسے بتا نہیں سکتی تھی، وہ اسے ٹیلی فون بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، کیونکہ وہ اس کی خشک باتیں سن کر اپنے پرمسرت لمحوں کو بے رنگ

ہیں کرنا چاہتی تھی۔

شجاع بھی نصرت کو پسند کرتا تھا، دونوں کے جسموں سے اٹھنے والی ریز ایک دوسرے کی کشش برقرار رکھے ہوئی تھیں، اور پھر ایک دن انہوں نے اپنی محبت کو امر بنانے کے لئے شادی کر لی۔۔۔ ایک مقدس بندھن میں بندھ کر روح و جسم کو یکجان کر کے زندگی کے ایک نئے روپ کو دریافت کر لیا۔

بہت سارے سال گذر گئے، نصرت اور شجاع کے آنگن میں پھول سے بچے کھیلنے لگے۔ اور پھر۔۔۔ نصرت کا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ شجاع کو کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد رکنا پڑا، گو اس کا تبادلہ بھی نصرت کے ساتھ ہی ہو چکا تھا، نصرت بچوں کے ہمراہ لاہور آ گئی۔

دوسرے روز وہ چارج سنبھالنے دفتر پہنچی تو سجاد کو اپنا منتظر پایا،

''سجاد۔۔۔ کیا حال ہے تمہارا؟'' نصرت نے بے نیازی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔۔۔ تم کیسی ہو؟'' سجاد نے پوچھا۔

''میں بہت اچھی ہوں اور خوش بھی۔۔۔ شجاع بہت اچھے ہیں، میرا بہت خیال رکھتے ہیں، تم سناؤ تمہارا فلسفہ کیا ہے؟ انس، محبت یا عشق'' نصرت نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

سجاد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، اور پھر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا،

نصرت کو آئے ہوئے کئی دن گذر گئے، دفتری ماحول کی سنجیدگی سے اسے وحشت ہونے لگی، اس سے تو اچھا تھا کہ سجاد اس سے بحث ہی کر لیا کرے، وقت تو گذرے۔

ایک دن وہ خود ہی سجاد کے کمرے میں چلی گئی۔

''سجاد کیا بات ہے؟ تم بہت سنجیدہ ہو گئے ہو۔ کیا کسی سے محبت ہو گئی ہے''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں نصرت۔۔۔ میں تو بالکل ویسا ہوں، جیسے پہلے تھا''

''پھر تم اس قدر بدلے بدلے سے کیوں ہو؟ نصرت نے اسے کریدا۔

''تم نے شادی کیوں نہیں کی؟''

''میں کسی کے حصار میں نہیں آنا چاہتا''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم کسی کے حصار میں نہیں ہو؟''

سجاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم اب بحث کیوں نہیں کرتے، میں چاہتی ہوں تم پہلے کی طرح اپنا فلسفہ بیان کرو، تاکہ میں اپنے تجربات کی روشنی میں تمہیں محبت کا نیا مطلب سمجھا سکوں''

''نصرت اب میرے پاس کوئی فلسفہ نہیں ہے اور نہ باتیں۔۔۔۔ احساس اور جذبات کے آگے ایک مقام ایسا آتا ہے، جہاں لفظ ختم ہو جاتے ہیں، یا شاید لفظوں کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔۔ وہ مقام فنافی الذات کا ہے، ایسی ذات میں خود کو فنا کر دینے کا جسے آپ دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔۔۔۔ اور اس مقام کا نام عشق ہے۔۔۔۔ میں انس، محبت اور عشق کے لفظوں کا مطلب نہیں جانتا، مگر صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ اب میرے لئے لفظوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی، جس دن تم گئی تھی اور اب جب تم آ چکی ہو، یہ دونوں لمحے میرے لئے ایک جیسے ہیں، کیونکہ تمہارے وجود کا ہونا یا نہ ہونا میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔ تم چاہو بھی تو مجھ سے دور نہیں

جا سکتی، اور کبھی دور گئی ہی نہیں تھی، پھر تمہارے آنے کی خوشی کیسی؟ مرے ہر لمحہ میں تم موجود تھیں، اور آئندہ ہر لمحہ میں موجود رہو گی، تمہارا شوہر، تمہارے بچے، تمہاری زندگی میرے احساسات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے نہ میں ان لمحوں میں شریک ہونے کی تمہیں اجازت دے سکتا ہوں۔ تمہاری اس دفتر میں موجودگی ایک اچھی بات ہے، مگر تم میرے ساتھ رابطہ رکھنے کی بجائے اپنے گھر اور بچوں پر توجہ دو۔۔۔ میرے پاس لفظوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے، میرے احساسات میں تم شریک نہیں ہو سکتیں۔۔۔ خدا حافظ''

نصرت نہایت حیرت سے اسے دیکھتی رہی، پھر اپنے کمرے میں آ گئی، کچھ دیر بعد وہ دفتر کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ سجاد کی ذہنی حالت پر اظہارِ افسوس کر رہی تھی۔





چاند کے پاس چاندنی نہ رہی
جلتے سورج میں روشنی نہ رہی
تو نہیں ہے تو ایسا لگتا ہے
سانس جاری ہے زندگی نہ رہی

پھر چلے جانا

محبت ایک خودرو پودے کی طرح دل کی زمین پر اگتی ہے۔

یہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ آپ اگر اس پودے کو اکھاڑنا چاہیں تو جڑیں اندر رہ جاتی ہیں۔ جو کانٹے بن کر روح کو زخمی کرتی رہتی ہیں، مجھے بھی تم سے ایسی ہی محبت ہوگئی تھی۔

جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، جمال احمد! شام کے دھندلکے میں جب درختوں کے سائے لمبے ہوگئے تھے، فضا میں خنکی پھیل رہی تھی۔

رات کی رانی کی خوشبو نے ہوا کو مستانہ کردیا تھا، کہیں، کہیں کوئی اکا دکا جگنو چمکتا، تو اس کی روشنی آنکھوں کو چمکا دیتی۔

چاند ابھی بادلوں کی اوٹ میں تھا۔

اچانک کوئی ستارہ ٹوٹ کر چمکا تھا۔

جس کی روشنی میں تمہارا پیلا اداس چہرہ نظر آیا تھا، یوں تو اس چہرے میں کوئی

خاص بات نہیں تھی۔

مگر پھر بھی وہ پہلی جھلک آنکھ کے کیمرے نے محفوظ کرلی تھی بالکل اسی طرح جیسے کوئی مشاق کیمرہ مین کسی بدلتے ہوئے منظر کو اچانک کلک کرلے اور بعد میں اس کا رزلٹ دیکھ کر خود ہی حیران ہو جائے۔

اس لمحے کی حیرانی نے مجھے پریشان نہیں کیا۔

بلکہ ایک عجیب سا سکون اور طمانیت دی۔

شاید یہ وہ لمحہ تھا جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی اور یہ وہ منظر تھا جس نے میرے دل کے خالی کینوس پر اپنا شاہکار منتقل کر دیا تھا۔ پھر یوں ہوا جمال احمد! کہ مجھے خود سے محبت ہوگئی، کتنی عجیب بات ہے — نا!

مگر یہی تو حقیقت ہے، ہمیں اپنی ذات کا ادراک اسی وقت ہوتا ہے جب ہم کسی کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یہ دنیا اچھی لگنے لگتی ہے، پھول، خوشبو، پہاڑ، جگنو، ندیاں، دریا، سمندر جھرنے، آبشاریں اور سارے موسم خود بخود خوبصورت ہو جاتے ہیں۔

اپنا وجود اچھا لگنے لگتا ہے اور زندگی سے پیار ہو جاتا ہے، تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گے۔

کیونکہ تمہیں تو کسی سے محبت ہوئی ہی نہیں، یہی کہا تھا نا تم نے!

تم اس جذبے سے ناواقف ہو، تم صرف دوستی کے قائل ہو۔

تمہارے بہت سے دوست ہیں اور یہ رشتہ ایک مضبوط رشتہ ہے، پائیدار رشتہ ہے، دوستی کا رشتہ۔

لیکن جمال احمد...... دنیا کے سب رشتے عارضی ہیں۔

''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول پر قائم ہیں۔ والدین، بہن بھائی، رشتہ دار، دوست احباب سب کچھ نہ کچھ چاہ رہے ہوتے ہیں، ان کی رفاقت قیمت مانگتی ہے اور انسان زندگی بھر ان رشتوں کی قیمت چکاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میاں بیوی کا مقدس رشتہ بھی اسی اصول پر قائم ہے۔

صرف ایک ہی رشتہ جو ان اصولوں سے بالاتر ہے اور وہ ہے محبت کا رشتہ...... جس میں کوئی لین دین نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں، کوئی بڑا چھوٹا نہیں۔

اس کی قیمت تو وہ خوشی اور سرشاری ہے، جو زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے اور اپنا وجود اچھا لگنے لگتا ہے، تمہیں ان باتوں کی سمجھ نہیں آسکتی، کیونکہ تم ایک مرد ہو........ جو شاید عورتوں سے زیادہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ دل سے زیادہ دماغ کی بات مانتے ہیں، نقصان سے زیادہ نفع کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اور ہر وقت کچھ نہ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں، یہ ہی دریافت کرنے کی جبلت انہیں ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتی...... ہر نئی عورت ان کیلئے ایک نئی دریافت ہوتی ہے...... ایک نیا جزیرہ...... یا پھر نیا سیارہ...... یا پھر ایک نئی دنیا۔ اسی لئے تو وہ جس سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اس سے بھی جلد کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

مرد ایک ایسا مسافر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی، یا شاید وہ کہیں رکنا ہی نہیں چاہتا۔ ٹھہرنا ہی نہیں چاہتا۔

تم آئے...... میرے پاس بیٹھے۔ مگر جلد ہی تمہاری طبیعت کی بے چینی نے تمہیں جانے پر مجبور کر دیا، میں تمہیں روکنا چاہتی تھی کیونکہ میں چاہتی تھی کہ، تم میرے

پاس رہو......میں تمہیں دیکھوں......تم سے باتیں کروں۔

اور اپنی روح کو سیراب کرتی رہوں۔ جو تمہارے بغیر پیاسی تھی، مگر تم جا رہے تھے......تم نے جانا تھا۔

ایک نئی سمت ایک نئی دنیا کی تلاش میں......ایک نئے سیارے پر......ایک نیا چاند کھوجنے..........

ساون کی رم جھم میں...... جب آدھے شہر میں سورج چمک رہا تھا۔ میں بھیگ رہی تھی۔

تم ایک روشن جگہ پر کھڑے تھے۔

میرے اوپر بادلوں کے سائے تھے۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

تمہارا چہرہ تمہارے دل کی طرح خشک تھا۔

اس پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

نا ہی نئی دنیا کی دریافت کی خوشی تھی۔

یا شاید تم اپنے جذبات کا اظہار کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔

یا پھر تم بہت اچھے اداکار تھے۔ اپنے محسوسات کو چھپانا جانتے تھے۔

میں نے کہنا چاہا۔ کچھ دیر تو رکو!

آؤ انتظار کریں پھر کسی ایسی شام کا...... جب چاند بادلوں کی اوٹ میں ہو۔

درختوں کے سائے لمبے ہو جائیں۔

رات کی رانی کی مہک فضا کو مستانہ کر دے، کوئی ٹوٹا ہوا تارا......تمہارے

چہرے پر پیلی روشنی سے اداسی کا رنگ بھر دے......پھر چلے جانا۔

تاکہ میں اس احساس کے ساتھ زندہ رہوں کہ تمہیں بھی مجھ سے بچھڑنے کا غم تو ہوا،

خواہ ایک لمحے کے لئے ہی..................



پیار، وفااور رشتے ناطے

پیار، وفااور رشتے ناطے
دنیا کے بازاروں میں
ہر شے کی اک قیمت ہے
لیکن میرے ہاتھ بھی خالی
جیب بھی خالی، دامن خالی
میں تو ایسا گاہک ہوں جو
ہر شوکیس کے سامنے رک کر
آہیں بھرتا رہتا ہے
خود سے لڑتا رہتا ہے

سیکنڈ ہینڈ

روما کو پرانی چیزیں خریدنا بہت پسند تھا، پرانی کتابوں کی دکان دیکھ کر اس کے قدم خود بخود رک جاتے اور وہ گھنٹوں پرانے رسالے اور بوسیدہ کتابیں الٹ پلٹ کر کے۔۔۔۔اپنے پسندیدہ قلمکاروں اور شاعروں کی کتابیں، بین الاقوامی انعام یافتہ کتابیں اور ان کے تراجم ڈھونڈتی رہتی، اس کے کمرے کی اکلوتی الماری ایسی ہی ہزاروں پرانی کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ جن میں سے بہت کم اس نے پڑھی تھیں، اسے تو بس اکٹھا کرنے کا جنون تھا، پڑھنے کا تو اسے ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔

روما کا کمرہ پرانی چیزوں کی دکان یا کسی عجائب گھر کا کونہ معلوم ہوتا تھا، جس میں پرانے زمانے کا فرنیچر، پرانے ڈیزائن کے برتن، پرانے ٹوٹے ہوئے اور کچھ مکمل مجسمے کمرے کے دروازوں پر پڑے پردے بھی سیکنڈ ہینڈ تھے، کشن اور بیڈ کورز بھی اس نے لنڈے بازار سے بڑی محنت اور تلاش کے بعد خریدے تھے۔

پرانی چیزوں میں نجانے کیا کشش تھی کہ وہ انہیں خریدے بغیر نہ رہ سکتی تھی، نئی چیزوں میں اسے وہ حسن اور انفرادیت نظر نہ آتی جو ان پرانی چیزوں میں تھی، وہ میو ہسپتال کے باہر پرانے جوتے بیچنے والوں سے بڑے شوق سے جاپان اور مختلف ممالک سے آئے ہوئے پرانے جوتے خریدتی اور پھر بڑے فخر سے اپنی سہیلیوں کو

بتاتی کہ یہ جوتے میرے کسی ماموں یا چچا نے امریکہ یا سعودی عرب سے نہیں بھیجے بلکہ میں نے نہایت کم داموں میں سیکنڈ ہینڈ خریدے ہیں،

روما نے اپنے غیر ممالک میں بسنے والے رشتہ داروں اور دوستوں سے بھی کہہ رکھا تھا، کہ میرے لئے باہر سے کوئی چیز نہ لے کر آئیں، کیونکہ میرے ملک میں وہی چیزیں جو وہ ہزاروں روپے خرید کر لاتے ہیں اور اس پر ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں، تھوڑی سی استعمال شدہ مگر نئی حالت میں نہایت کم داموں میں مل جاتی ہیں، اس لئے باہر سے آنے والے احباب کو ہدایت کی گئی تھی، کہ وہ اس کے لئے صرف خوشبو لایا کریں۔۔۔کیونکہ خوشبو یہاں اصلی نہیں ملتی، جعلی خوشبوئیں، اصلی لیبل لگا کر بہت مہنگی فروخت ہوتی ہیں، اس لئے ایک خوشبو ایسی چیز ہے جو نایاب ہے۔۔۔اور جو سیکنڈ ہینڈ خریدی نہیں جا سکتی۔

روما لمبے قد، سرخ و سفید رنگت، لمبے گھنیرے بالوں والی سیاہ چشم حسینہ تھی، مقامی سکول میں پڑھاتی تھی، اور اپنے منگیتر احمد کی واپسی تک اسے بچوں کے سکول میں پڑھانا تھا، اسے بہت شدت سے اس دن کا انتظار تھا، جب اس کا منگیتر اپنی تعلیم مکمل کر کے انگلینڈ سے وطن واپس آئے گا۔اور وہ ہمیشہ کے لئے اس شب و روز سے چھٹکارا حاصل کر لے گی۔کتنی بوریت تھی۔۔۔اور یکسانیت بھی، روزانہ صبح سویرے اٹھ کر تیار ہونا۔۔ ہر روز سکول جا کر بچوں کے ساتھ سر کھپانا اور شام کو گھر آ کر سو جانا۔۔۔کبھی کبھی اپنی کسی سہیلی کے ساتھ بازار چلی جاتی اور سیکنڈ ہینڈ کتابیں، کپڑے، جوتے ڈھونڈتی رہتی، پرانے کپڑوں اور پرانی کتابوں کی خوشبو اسے بہت اچھی لگتی تھی۔۔۔۔انہیں خرید کر گویا اسے دنیا بھر کی خوشی مل جاتی، وہ جب بھی کوئی

چیز خریدتی تو اپنی سہیلیوں کو ضرور دکھاتی، وہ اس کی بے وقوفی یا اس کی حرکت پر خوب ہنستیں، کبھی کوئی کہہ دیتی کہ اتنی ساری بے کار چیزیں اکٹھی کرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی اچھی اور نئی چیز خرید لی جائے لیکن ایسی باتوں پر وہ کبھی کان نہ دھرتی۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن پتہ چلا، احمد آ گیا ہے۔احمد آ گیا، وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی، اس کے پاؤں زمین پر نہ لگ رہے تھے۔اس کا سالوں کا انتظار ختم ہو گیا تھا، اور اب اس کی زندگی میں خوشیوں کی بہار آنے والی تھی، ایک نئی بہار۔۔۔۔اپنا گھر۔۔۔۔اور احمد کا پیار۔۔۔۔اس نے رات بھر خود کو بار بار آئینے میں دیکھا۔۔۔۔اور احمد کو تصور کر کے اس کے لمس اور اس کے بوسوں کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا بدن بار بار کانپا اور اس کے گالوں کے گلاب بھر گئے۔

صبح تھی کہ ہونے کو نہ آ رہی تھی، جسم میں انگارے بھرتے جا رہے تھے۔آنکھوں سے نیند دور ہو چکی تھی، خدا خدا کر کے صبح ہوئی، اس نے اپنے بہترین کپڑے زیب تن کئے، آنکھوں کو مسکارے سے سجایا، اور بال کھول کر سرخ کلپ لگا لیا، کچن میں جا کر اس نے جلدی جلدی احمد کی پسند کی کئی ڈشیں تیار کر لیں، ٹھیک دس بجے دروازے پر دستک ہوئی، دل کی دھڑکن یکدم سے بند ہو کر پھر تیز ہو گئی، وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔امی نے دروازہ کھول دیا تھا، اور وہ احمد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیں دے رہی تھیں۔

انتظار ختم ہو گیا تھا، دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں، قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی اس کے دروازے پر رک گئی،

''روما'' احمد نے پکارا۔

''جی''اس نے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا، بھلا تین سال بعد اتنے سارے انتظار کے بعد بھی خود پر قابو رکھا جا سکتا ہے۔ آنسو آنکھوں سے چھلکنے کے لئے بے تاب تھے۔

''کیسی ہو روما؟''احمد نے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی اچھی ہوں''اس نے ابھی تک نظریں اٹھا کر اسے دیکھا بھی نہ تھا۔

''یہ میرا بیٹا ہے روما۔۔۔۔روہن''

''جی''اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، ایکدم جیسے اس نے بجلی کی ننگی تاروں کو چھولیا ہو، اس نے نظریں اٹھائیں، احمد کی گود میں ایک دو سال کا گول مٹول بچہ نیلی نیلی آنکھوں میں حیرت لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم نے شادی کر لی احمد؟''اس نے آہستگی سے پوچھا۔

ہاں روما۔۔۔میں نے شادی کر لی تھی، مجھ سے غلطی ہوگئی۔۔۔لیکن اب میں اس انگریز عورت سے چھٹکارا پا چکا ہوں۔۔۔اور تمہارے پاس آ گیا ہوں۔۔۔اپنا بیٹا بھی واپس لے آیا ہوں۔۔۔اب یہ تمہارے پاس رہے گا۔۔۔تم اس کی ماں ہو۔۔۔میں آج ہی آنٹی سے شادی کا دن مقرر کر لیتا ہوں''

وہ نجانے کیا کچھ کہتا رہا، روما چپ چاپ بت بنی اسے دیکھتی ہی رہی۔۔۔۔

''تم شاید تھکی ہوئی ہو۔۔آرام کر لو میں شام کو پھر آؤں گا''یہ کہہ کر احمد اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔روما کو کمرے کی چھت گرتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس کی الماری میں پرانی کتابیں، کارنس پر سجے پرانے مجسمے، دروازوں پر لٹکے سیکنڈ ہینڈ پردے قہقہے لگانے لگے۔

تمہیں پرانی اور استعمال شدہ چیزیں پسند تھیں نا روما بی بی۔۔۔اس لئے تمہیں جیون ساتھی بھی تو پرانا اور استعمال شدہ ملنا چاہیئے تھا۔۔۔نئی چیزوں میں تو تمہارے لئے کوئی کشش نہ تھی۔۔۔اب سیکنڈ ہینڈ مرد کے ساتھ زندگی گذارو۔۔۔۔ہاہا۔۔۔''

''نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا''وہ چیخ پڑی اور دوسرے ہی لمحے اس نے دروازوں پر پڑے پردے پھاڑ دیئے، کتابیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔۔۔اور سارے مجسمے توڑ دیئے۔





عورت اپنا آپ بچا لے
تب بھی مجرم ہوتی ہے
عورت اپنا آپ گنوا لے
تب بھی مجرم ہوتی ہے

بھاگوان

نجمہ بیگم کے لئے جب نائب تحصیلدار کا رشتہ آیا تو خاندان بھر نے حیرت سے انگلیاں دانتوں تلے دبالیں، یہ لڑکی تو بڑی بھاگوان نکلی، ورنہ شاہ جی بے چارے تو سات بیٹیوں کے غم میں گھلے جارہے تھے۔ کہ اتنے رشتے کہاں سے آئیں گے؟ جہیز کس طرح بنے گا؟ اور وہ اپنی زندگی میں کس طرح اس فرض سے سبکدوش ہوں گے۔ بڑی تین بیٹیاں تو انہوں نے جیسے تیسے اپنے رشتہ داروں میں بیاہ دی تھیں، وہ لوگ بھی سفید پوش تھے، لڑکے بھی خاص کماؤ نہ تھے، مگر کیا کرتے بیٹیوں کا بوجھ بھی باپ کے کندھوں پر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ تینوں اپنے گھروں میں قسمت پر راضی، صبر شکر کر کے وقت گذار رہی تھی، لیکن حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لائی تھیں۔

نجمہ بیگم کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ شاہ جی کی گردن جھکتی جارہی تھیں، اور ابھی تین اور بھی باقی تھیں، روز صبح یہ آس لے کر اٹھتے کہ شاید کوئی پیغام لے کر آجائے تو وہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں، مگر صبح کا سورج اپنا سفر مکمل کر کے غروب ہو جاتا اور شام کے اندھیرے چھا جاتے، مگر دروازے پر کوئی دستک نہ ہوتی، شاہ جی کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتیں اور وہ سوچنے لگتے کہ شاید کسی نے غلط ہی کہا ہے، جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر ضرور آتے ہیں، جبکہ اس گھر میں ایک دو نہیں اکٹھی

چار جوان لڑکیاں رشتوں کے انتظار میں ڈھل رہی تھیں، مگر شاید سب رشتہ دار اور عزیز یہ بھول چکے تھے، کہ ادھر بھی رخ کرنا ہے۔ شاہ جی کی بیگم دن رات اپنے ہی خاوند کو کوستی رہتی "یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، کہا تھا پہلی لڑکیوں کی شادی خوب دھوم دھام سے کرو، دکھاوے کا زمانہ ہے، چاہے ادھار مانگو، جائیداد بیچو، مگر جہیز خوب ہونا چاہیئے، ورنہ رشتہ دار دوبارہ اس گھر کی سیڑھیاں نہ چڑھیں گے۔ اب بھلا جن رشتہ داروں اور عزیزوں نے بڑی بیٹیوں کی شادیوں میں شرکت کی تھی، وہ کیونکر رشتہ مانگنے لگے؟ اتنی سادہ تقریب تو آجکل قل اور چہلم کی بھی نہیں ہوتی۔

بیوی کے کوسنے سن کر شاہ جی حقہ گڑگڑانے لگتے یا پھر کوئی کتاب اٹھا کر مطالعہ شروع کر دیتے۔

شاہ جی کی بہن فاطمہ اپنے بیٹے کی شادی کا دعوت نامہ لے کر آئی تھی، اس نے خاندان سے باہر کسی بڑے گھر میں بیٹے کا رشتہ طے کیا تھا، جو نہ صرف دلہن کو جہیز میں کار بھی دے رہے تھے، بلکہ ساس کے لئے انہوں نے سونے کے کڑے اور جھمکے بھی بنوائے تھے۔ اس نے اصرار کیا کہ لڑکیوں کو ساتھ ہی بھیج دیں کیونکہ گھر میں مہمانداری کی وجہ سے کام بڑھ گیا تھا۔ اوران کی اپنی کوئی بیٹی نہ تھی، لہذا شاہ جی نے اپنی بیٹیوں کو پھوپھی کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ لڑکیوں نے خوشی خوشی اپنے بہترین لباس بیگ میں رکھے اور پھوپھی فاطمہ کے ساتھ چلی گئیں۔

پہلے ہی روز جب نجمہ بیگم گوٹے لگا نارنجی سوٹ پہنے، پھولوں کی ٹوکری اٹھائے بالائی منزل پر جا رہی تھی، کہ اچانک اس کی ٹکر اوپر سے آتے ہوئے شخص سے ہوگئی، اس سے پہلے کہ وہ سیڑھیوں میں گرتی چلی جاتی، اس نے بڑھ کر نجمہ بیگم کو سنبھال لیا،

جب اس کے حواس درست ہوئے تو وہ پھوپھی فاطمہ کے دیور ناظم کی بانہوں میں تھی، اس نے گھبرا کر خود کو سمیٹا اور پھولوں کی ٹوکری اٹھائے بغیر ہی نیچے بھاگ گئی۔

ناظم نیا نیا نائب تحصیلدار بنا تھا، شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی اس نے اپنی بھابھی کے پاؤں پکڑ لئے کہ "مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے بس نجمہ بیگم سے شادی کرادو" اور اس کے شدید اصرار پر پھوپھی کو اپنے بھائی کے گھر رشتہ مانگنے جانا ہی پڑا۔

شاہ جی اور ان کی بیگم تو حیران ہوئے ہی تمام اہل خاندان نجمہ بیگم کی قسمت پر رشک کرنے لگے، اور جلد ہی نجمہ بیگم شہنائیوں کی گونج میں شاہ جی کے آنگن سے رخصت ہو کر ناظم کے گھر چلی گئی۔

شاہ جی کے جھکے شانے ڈیڑھ انچ سیدھے ہو گئے اور اب وہ صحن میں بیٹھ کر اونچی آواز میں ریڈیو پر کلاسکی موسیقی کے پروگرام سننے لگے۔

ناظم نہایت پیار کرنے والا شوہر ثابت ہوا،، وہ اپنی دلہن نجمہ کا بہت زیادہ خیال رکھتا، جلد ہی ان کا آنگن ہنستی، مسکراتی کھیلتی ہوئی گڑیوں سے بھر گیا، رشیدہ، حمیدہ، سعیدہ کے بعد جب رقیہ پیدا ہوئی تو ناظم کی آنکھوں میں بے اعتنائی کی جھلک آ گئی، اور اس نے زیادہ وقت اپنے دفتری کاموں میں گذارنا شروع کر دیا۔

نجمہ بیگم کو نصیبوں والی اور بھاگوان کہنے والے لوگ اب اس کی حالت پر افسوس کرنے لگے، نجمہ حیران تھی کہ اس کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا، روپے پیسے کی ریل پیل تھی پھر لوگ اسے دیکھ کر اظہار افسوس کیوں کرتے ہیں؟ اور عورتیں اسے دیکھ کر آہیں کیوں بھرنے لگتی ہیں؟ ٹھیک ہے اس کے گھر اولاد نرینہ نہیں، مگر لڑکیاں بھی تو اولاد ہی ہوتی ہیں، اور اس کا گھر اس نعمت سے بھرا پڑا تھا۔ پھر ناظم نے بھی کبھی اس

بات کا اظہار نہ کیا تھا کہ اسے اولادِ نرینہ کی خواہش ہے۔

ناظم کے تحصیلدار بننے پر اسے پھر ''بھاگوان'' ہونے کی سند مل گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی ناظم کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہو گیا انہوں نے نجمہ سے کہا ''تم لاہور میں رہو'' کیونکہ بچیاں اب سکول میں پڑھتی ہیں، جس جگہ میرا تبادلہ ہوا ہے، وہاں لڑکیوں کے لئے کوئی سکول نہیں ہے۔''

نجمہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، اسے تو اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوانا تھی، کیونکہ اسے اپنی تعلیمی کم مائیگی کا شدت سے احساس تھا، ناظم چلا گیا، اور نجمہ اپنی بچیوں اور گھریلو ملازم نذیر کے ہمراہ اکیلی رہ گئی، نذیر صبح سویرے اٹھ کر اسے جگاتا، بچیوں کو سکول کے لئے تیار کرتا اور پھر وہ دونوں مل کر بچیوں کو سکول چھوڑنے جاتے واپسی نذیر کھانا پکانے کا سامان خرید لیتا اور گھر آ کر وہ بچوں کے کپڑے سینے میں مصروف ہو جاتی، اور نذیر کھانا پکانے کے بعد گھر کی صفائی وغیرہ بھی کر دیا کرتا، یونہی بچوں کی چھٹی کا ٹائم ہو جاتا اور وہ دونوں بچوں کو سکول سے لانے کے لئے چلے جاتے۔

ناظم ایک مہینے بعد گھر آیا تو دفتر کی بہت سے فائلیں بھی ساتھ لے آیا، وہ اپنے کمرے میں ان فائلوں پر جھکا رہتا، لہذا نجمہ بیگم کے معمول میں اس کے آنے سے کوئی فرق نہ آ سکا۔ وہ یونہی نذیر کے ہمراہ بچوں کو سکول چھوڑنے اور لانے جاتی رہی، ایک ہفتہ رہ کر ناظم واپس گیا۔

کبھی کبھی تنہائی سے نجمہ کو گھبراہٹ ہونے لگتی، بچیاں شام ڈھلتے ہی سو جاتیں اور وہ دیر تک جاگتی رہتی، کبھی کبھی وہ نذیر کو روک لیتی اور اس سے پوچھتی ''تمہارا رنگ اتنا سانولا کیوں ہے؟ وہ بے چارہ جھینپ جاتا اور کہتا ''جی میری ماں تنور پر روٹیاں

لگایا کرتی تھی، وہ کہتی تھی تنور کی آگ سے قریب رہنے کی وجہ سے تیرا رنگ جل گیا ہے۔'' اس کے بعد نجمہ اس سے اس کے گاؤں اور رشتہ داروں کے بارے پوچھتی رہتی اور یونہی کافی وقت بیت جاتا۔

آہستہ آہستہ نذیر نے باہر والے کمرے میں سونے کی بجائے گھر کے صحن میں چارپائی ڈال لی، اور نجمہ بیگم کا احساسِ تنہائی کم ہونے لگا۔

ناظم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو فائلیں اٹھائے گھر آتا اور دو چار دن رہ کر واپس چلا جاتا، محلے کی عورتیں اور رشتہ دار جب بھی نجمہ سے ملتے اسے لڑکا نہ ہونے کا طعنہ دیتے یا پھر اس انداز سے اظہارِ افسوس کرتے کہ وہ جھنجھلا اٹھتی، انہی شب و روز میں تین برس بیت گئے، اور ایک دن پتہ چلا، کہ نجمہ امید سے ہے، ناظم یہ سن کر ایک لمحہ کو چونکا، اور پھر امید کی روشنی اس کی چہرے پر پھیل گئی، گو اس نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا، نذیر پہلے سے زیادہ نجمہ بیگم کا خیال رکھنے لگا، اب تو وہ اسے گھر کا کوئی کام نہ کرنے دیتا، بلکہ رات دیر تک نجمہ بیگم کے پاؤں بھی دباتا رہتا، بچیاں حیرت سے ماں کے جسم میں ابھرتے ہوئے حصوں اور تبدیلیوں کو دیکھتیں اور شرما جاتیں، جب نجمہ کے ہسپتال جانے کا وقت آیا تو ناظم بھی چھٹیاں لے کر گھر آ گیا، اس نے اپنی والدہ اور نجمہ بیگم کی والدہ کو بھی بلوا لیا، کئی سسرالی عورتیں بھی آ گئیں۔

خدا خدا کر کے وہ لمحہ آیا، جب لیڈی ڈاکٹر نے آ کر کہا ''مبارک ہو۔۔۔ بیٹا ہوا ہے''

یہ سنتے ہی سب کے منہ سے نکلا، نجمہ واقعی بھاگوان ہے، اللہ نے اسے اولاد نرینہ بھی عطا کر دی، تھوڑی دیر بعد نرس لیبر روم سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں سفید

کپڑے میں لپٹا ہوا بچہ تھا، جسے اس نے ناظم کی والدہ کی گود میں دے دیا،

''ارے اس کا رنگ کس پر گیا ہے، خاندان میں تو کوئی سانولا نہیں''

پھوپھی فاطمہ نے حیرت سے کہا، تو ناظم کی ماں بولی۔

سانولا ہے تو کیا ہوا؟ ہے تو نجیب الطرفین!



خیالِ یار سے پہلے

وہ آنکھیں بند کیے جھوم رہی تھی۔

قوالی کی لَے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ قوال اونچی آواز میں منقبت گا رہے تھے۔ تالیوں کی تال اور ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اس کے پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ اس نے اپنے لباس کے اوپر سبز رنگ کا عبایا پہن رکھا تھا۔ گلے میں سرخ رنگ کے دانوں والی تسبیح تھی۔ اور اس کے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔

اس کے جسم میں اتنا کرنٹ، اتنی طاقت نجانے کہاں سے آ گئی تھی۔ کہ دو نوجوان اسے تھامنے کی کوشش کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ارم گل یہاں پہنچی تھی۔ یہ لاہور شہر کے موچی دروازے کی تنگ گلیوں کے اندر ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ جس میں ڈیوڑھی، چھوٹا سا صحن اور دو کمرے تھے۔ ڈیوڑھی کی بائیں طرف چولہا اور کچھ برتن رکھے تھے۔ گویا یہ حصہ اس گھر کا باورچی خانہ تھا۔

جو عورت قوالی کی تال پر محوِ رقص تھی۔ وہ اس گھر کی واحد مکین تھی۔ ارم گل اسے رقص ہی سمجھ رہی تھی۔ وہ دھمال تھی، وجد تھا یا کچھ اور، کیونکہ یہ ارم گل کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا۔ اس سے قبل اسے قوالی سننے اور اس طرح ''حال'' دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے جب وہ موچی دروازے کی گلیوں سے گذرتے ہوئے پرانے

لاہور شہر کی مخصوص باس کو محسوس کرتے ہوئے اس گھر کے لکڑی کے دروازے میں داخل ہوئی تھی۔ تو وہ عورت سفید لباس میں ملبوس مسکراتی ہوئی اسے ملی تھی ..... اسکی عمر کوئی ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ قد دراز تھا۔ رنگت سفید، تیکھے نقوش اور بڑی بڑی کچھ سوچتی ہوئی آنکھیں ..... ارم گل کو پہلی ہی نظر میں وہ باوقار بزرگ خاتون نہایت اچھی لگیں۔ انہوں نے بھی بڑھ کر ارم گل کو خوش آمدید کہا۔ اور گھر کے ایک کمرے کے اندر لے گئیں۔ اس کمرے میں پہلے سے کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ جو اپنے لباس اور میک اپ سے نہایت خوشحال گھرانوں کی خواتین لگ رہی تھیں۔ کمرے میں فرشی نشست تھی۔ ایک دری پر سفید چادر بچھائی ہوئی تھی۔ ان عورتوں نے سرک کر ارم گل کے لیے جگہ بنائی۔ اور ارم گل ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔

کمرے کی چھت لکڑی کے بالوں سے بنی ہوئی تھی۔ جن کے اوپر ترتیب سے اینٹیں جڑی تھیں۔ ان بالوں پر مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر پیلے رنگ کی سفیدی تھی۔ یا پھر سفیدی کی رنگت زردی مائل ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ سے چونا اکھڑا ہوا تھا۔ کمرے کی بائیں دیوار میں ایک طاق تھا۔ جس میں کچھ دوائیوں کی شیشیاں اور ڈبے رکھے تھے۔

بائیں کونے میں ایک جائے نماز بچھی تھی۔ جس کے محراب پر تسبیح رکھی ہوئی تھی۔ اس جائے نماز کے گرد مٹھائی کے چند ڈبے رکھے تھے۔ مٹھائی تازہ تھی اور اس کی خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

ارم گل نے اپنے ساتھ بیٹھی خواتین کو دیکھا۔ مسکراہٹیں تبدیل ہوئیں اور پھر

تعارف شروع ہوا۔ سب خواتین کا تعلق لاہور کے متمول گھرانے سے تھا۔ اور انکی رہائش گلبرگ کے علاقے میں تھی۔ یہ گھرانہ شہر کے امیر ترین کاروباری گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر کئی برس پہلے جب انہوں نے کاروبار شروع کیا تھا۔ تو اسی گھر میں رہتے تھے۔ جوں جوں کاروبار ترقی کرتا گیا۔ اکبری منڈی کی دکان سے انار کلی اور پھر لبرٹی مارکیٹ میں انکے پلازے بن گئے تو انہوں نے گلبرگ میں چار کنال کی کوٹھی بنا لی۔ سب لوگ ادھر شفٹ ہو گئے۔ مگر یہ خاتون جوان کی پھوپھی تھی۔ نے پرانے گھر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا.... کیونکہ ان کا بچپن اور جوانی اسی گھر میں گذرے تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ کیونکہ ان پر کسی شاہ صاحب کی روح کا سایہ تھا۔ وہ شاہ صاحب اس گھر میں اسی کمرے میں رہتے تھے۔ اسی جائے نماز پر نماز پڑھتے تھے..... اور پھوپھی صاحبہ کے علاوہ کبھی کسی کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھوپھی صاحبہ نے ساری زندگی انکے انتظار میں گذار دی تھی۔ وہ روزانہ اس کمرے میں چراغ روشن کرتیں۔ انکے پینے اور وضو کے لیے پانی رکھتیں۔ اور رات بھر عبادت میں مصروف رہتیں۔ کیونکہ ان کے بقول انہیں انکے شاہ صاحب کی طرف سے ہدایات ملتی تھیں۔ اور وہ ان کے مطابق عمل کرتی تھیں۔

رات ڈھلتی جا رہی تھی..... قوالوں کی آوازیں اور ڈھولک کی تھاپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دنیا و جہان سے بے خبر ''دھمال'' یا ''حال'' میں مگن تھیں ... اتنی زیادہ مشقت کہ طاقتور سے طاقتور جسم بھی تھک جائے۔ مگر ان کے چہرے اور جسم پر تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے.... انہیں یقین تھا جیسے آج کی شب شاہ صاحب کے ساتھ انکی شبِ وصال ہے.... اور ان کا برسوں کا انتظار ختم

ہونے والا ہے.... ارم گل حیران بھی تھی اور پریشان تھی.... اسے پھوپھی صاحبہ کی صحت کی فکر ہو رہی تھی.... جو اپنے ہی جہان میں مگن ہو کر یہ بھول چکی تھیں کہ وہ کہاں پر ہیں۔ یا وہ اپنے آباد کیے ہوئے جہان کے تصور میں گم تھیں۔ انکے پاؤں تھرک رہے تھے، جسم بے قابو تھا، بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ قوالی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

جمالِ یار کو دیکھوں کمالِ یار سے پہلے
میں خوشبو کی طرح مہکوں خیالِ یار سے پہلے

وہ جمال.... خیال اور وصال سے گذر کر کمال کی منزلوں کی طرف جا رہی تھیں۔ مگر شاید ان کی کیفیت کو کمال حاصل نہیں ہوا تھا.... لہٰذا مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی... قوالوں کے ہاتھ اور آواز خود بخود رک گئی.... محفل پر سکوت چھا گیا۔

پھوپھی صاحبہ نے حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ آنکھیں کھول کر سب کی طرف دیکھا۔ پھر دھڑام سے کچے فرش پر گر گئیں.... اور آنکھیں بند کر لیں.... انکے چہرے پر عجیب سا سکون اور طمانیت پھیلی ہوئی تھی۔



کیا جواب دے؟

نادرہ کا گھر عظیم سٹریٹ کا پہلا گھر تھا۔ یہ عظیم سٹریٹ کیلوں والی سڑک یعنی براندرتھ روڈ پر اڈہ کراؤن بس کے بعد دائیں ہاتھ کی پہلی گلی تھی۔ سڑک کے بائیں کنارے پر جتنی گلیاں تھیں وہ رام گلی کہلاتی تھیں۔ پہلی رام گلی میں بوٹا مل کا اکھاڑا تھا۔ دوسری رام گلی میں مسز بیگ کا سکول تھا۔ جو قادیانی فرقے سے تعلق رکھنے والے مسٹر بیگ نے کھول رکھا تھا۔ اسی سکول میں نادرہ اور اس کا چھوٹا بھائی ناصر پڑھتے تھے۔ بغیر بجلی اور چھت کے، تنکوں سے بنے چھپر تلے، پھٹے ہوئے ٹاٹوں پر بیٹھ کر Ba Ba Black Sheep گایا کرتے باہر بوڑھے مسٹر بیگ کبھی کبھی کلاس میں آ کر Noun اور اس کی قسمیں یاد کرایا کرتے۔ پہلے پیریڈ میں نماز یاد کرائی جاتی اور دوسرے میں قرآن شریف کے سیپارے پڑھائے جاتے۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی ذریعہ تعلیم اور کم فیس ہونے کی وجہ سے پورے علاقے میں اس سکول کی بڑی دھوم تھی۔ علاقے کے لوگ بڑے ذوق وشوق سے اس سکول میں بچوں کو داخل کرواتے۔ بچے بھی یہاں عام طور پر خوش رہا کرتے۔ کیونکہ بارش کے موسم میں جب چھپر ٹپکنے لگتا یا تیز ہوا اور آندھی میں اس کے اڑ جانے کا امکان ہوتا تو سکول میں چھٹی ہو جایا کرتی۔ کبھی کبھی سالانہ احمدیہ کنونشن ہوتا اور بچے اکٹھی ہفتہ بھر کی چھٹیاں منایا

کرتے۔

رام گلی نمبر دو میں اکبر خان کا گھر تھا۔ جو نادرہ کے والد کے ہمراہ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کا لڑکا اکمل خان اپنے والد کی انگلی پکڑ کر انکے گھر آجایا کرتا وہ پہروں گلی ڈنڈا، پٹھو گرم اور لکن میٹی، اونچ نیچ وغیرہ کھیلا کرتے۔

اکبر خان کے پرانے طرز کے مکان میں چاروں طرف لکڑی کے چھجے تھے اور درمیان میں صحن، دوسری منزل کے ایک بڑے کمرے میں چرخہ پڑا تھا۔ جس پر اکبر خان کی بیوی روئی کاتتی رہتی۔

رام گلی نمبر 4 میں نادرہ کی سہیلی صوفیہ اور اسکا چچا زاہد رہتے تھے۔ یہ چچا بھتیجی چونکہ ہم عمر تھے اس لیے ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ صوفیہ کو تختی لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے بچپن میں ہی اس کی لکھائی بہت پختہ ہوگئی تھی۔

صوفیہ کے گھر کے آگے سلطان کی سرائے تھی۔ چوک دالگراں پر پہنچ کر ساری رام گلیاں ختم ہوجاتی تھیں۔ جہاں منے گجر کا گھر تھا۔ منے گاجر کا بیٹا آنکھوں میں سرمہ ڈالے قمیض میں چاندی کے بٹن لگائے گلے میں تعویز پہن کر انکے گھر دودھ دینے آتا۔ اسے منڈوا دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جس رات وہ منڈوا دیکھتا صبح اس کی دیر سے آنکھ کھلتی اور اس روز صبح کو چائے کے لیے اس کا انتظار کرنا پڑتا۔

یہ سارا علاقہ بڑی بڑی عالیشان عمارات اور خوبصورت مکانوں پر مشتمل تھا۔ یہاں کی دکانیں اور عمارتیں ہندوؤں نے بنوائی تھیں اور تقسیم ہندوستان کے بعد انہیں چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ کبھی کبھی نادرہ کی امی اسے بتاتیں کہ "میں نے اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھا کہ لوگ آشا کے گھر کو آگ لگا رہے ہیں۔ آشا بہت خوبصورت لڑکی

تھی۔ جب وہ ساڑھی پہن کر کتابیں پکڑے اپنے بھائیوں کے ہمراہ کالج جانے کے لیے نکلتی تو میں اس کھڑکی سے اسے دیکھا کرتی۔"

نادرہ امی سے پوچھتی "آگ لگنے کے بعد کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں کیونکہ ہمارے دادا نے اپنے گھر کے تمام دروازے، کھڑکیاں بند کر لیے تھے اور بچوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ دوسرے دن وہ سجا سجایا خوبصورت مکان ایک کھنڈر بن چکا تھا۔"

وہ لوگ زندہ رہے یا جل گئے اس بارے میں بھی امی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کیونکہ تقسیم ہندوستان کے وقت ان کی عمر بمشکل 10 برس تھی اور ملک میں کیا ہو رہا تھا۔ گھروں کو آگ کیوں لگائی جا رہی تھی۔ شاہ عالم مارکیٹ کس لیے جلائی گئی۔ گورکھا فوج گلیوں میں کس لیے گشت کرتی تھی۔ بس رات کو کبھی شور سن کر آنکھ کھل جاتی تو نعرے لگاتے جلوس دکھائی دیتے یا پھر آسمان پر سیاہ دھویں کے بادل۔ صرف اتنا پتہ چلتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر بہت ظلم ہو رہے ہیں۔ امرتسر سے جو ٹرین لاہور پہنچی اس میں سب لاشیں تھیں کیونکہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔

"لوگ دوسروں کے گھر کیوں جلاتے ہیں امی؟ نادرہ امی سے پوچھتی تو وہ کہتی "ہمارا مذہب ان سے جدا تھا۔ وہ کافر تھے ہم مسلمان ہیں۔ سب قوموں سے افضل ہیں۔ ہم خدا کو ایک مانتے ہیں۔ ہمیں اپنی عبادت کے لیے اپنے رہن سہن کے لیے آزادی کی ضرورت تھی۔ ایک آزاد ملک کی، اس لیے جلوس نکلتے تھے۔ لوگ مسلم لیگ زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ "بن کے رہے گا پاکستان" کہتے اور آخر کار ہم نے اپنا ملک آزاد کرالیا۔ پاکستان بنالیا اب ہم آزاد ہیں۔ سب مسلمان ہیں، سب کا ایک ہی

ذہب ہے اب ہمارے درمیان کوئی کافر نہیں۔ پاکستان ہمارا ملک ہے۔ آزاد ملک، ہماری اپنی حکومت ہے اب ہم انگریز کے غلام نہیں ہیں۔''

آزادی، مذہب، ملک یہ ساری باتیں سمجھنے کے لیے نادرہ کو اپنے ڈیڈی اور دادا سے ہزاروں سوال پوچھنے پڑتے۔ جب وہ اسکے سوالوں سے تھک جاتے تو چپ کر کے سونے کو کہتے۔ ان دنوں رات بہت جلدی ہو جایا کرتی تھی۔ سب کو جلد ہی نیند آ جاتی۔ صبح بھی جلدی ہوتی تھی اور بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ ہر گھر سے لکڑی کا دھواں اٹھتا اور گرم پراٹھوں کی خوشبو آیا کرتی۔ نادرہ اور اس کا بھائی ناصر چولہے کے قریب امی کے پاس بیٹھ کر توے سے پراٹھا اترنے کا انتظار کرتے اور چھری سے اس پر اپنی نشانی لگا دیتے۔

ہر پراٹھے کے اوپر ڈیزائن اور رنگ الگ ہوتا تھا۔ آگ اس پر طرح طرح کے پھول بناتی اور انہیں پراٹھا کھانے سے زیادہ اس پر بنی تصویر سے دلچسپی ہوتی تھی۔ سکول سے واپس آ کر ہر جمعرات کو وہ دونوں حضرت عباس علمدار کے علم کے نیچے دیوں میں تیل ڈالنے جاتے۔ یہ علم چوک برف خانے میں بسم اللہ پان والی کی دکان کے باکل سامنے لگا ہوا تھا۔ جس کے پاس راہگیروں کی پیاس بجھانے کے لیے مٹی کے بڑے بڑے چھ مٹکے پڑے تھے۔ جن میں سے پہلے پر اللہ، دوسرے پر محمد ﷺ، تیسرے پر علیؑ، چوتھے پر فاطمہؑ، پانچویں پر حسنؑ اور چھٹے پر حسینؑ لکھا ہوتا تھا۔ علم کے ساتھ والی دیوار پر چار مصرعے لکھے تھے۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا اللہ است حسینؑ

نادرہ اور اس کا بھائی اس کے ہجے ملا کر پڑھنے کی کوشش کرتے اور پھر اپنے دادا سے اس کا مطلب پوچھتے۔ محرم کے دنوں میں روزانہ رات کو سب گھر والے موچی دروازے میں نواب صاحب کی حویلی میں مجلس سننے جاتے اور نادرہ اور اس کا بھائی امی کے پاس ہی تھڑے پر سو جاتے۔ مجلس کیا ہوتی ہے، مولوی کیا کہتا ہے۔ یہ سب باتیں انکی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ جب امی اور دوسری عورتیں دھاڑیں مار مار کر روتیں تو انکی آنکھ کھل جاتی اور وہ حیرت سے سب کو دیکھتے رہتے۔

پانچویں محرم کو گوالمنڈی سے مہدی حسن کے گھر سے ذوالجناح کا جلوس برآمد ہوتا۔ یہ جلوس اڈہ کراؤن بس سے گذر کر موچی دروازے جاتا تھا۔ لہٰذا راستے میں نادرہ کے دادا، چچا اور ڈیڈی بھی شربت اور دودھ کی سبیلیں لگاتے اور ماتم کرنے والوں کو پلاتے۔

اس علاقے میں محرم کی طرح ہر تہوار جوش و خروش سے منایا جاتا۔ شبِ برات کو حلوے پکتے اور خوب آتش بازی اور چراغاں ہوتا۔ رمضان کے مہینے میں رات بھر نعت خواں ٹولیاں، روزہ رکھنے والوں کو سحری میں جگانے کے لیے آتیں۔ عید کے موقعوں پر شاہ محمد غوث کے مزار کے پاس دہلی دروازے کے باغ میں قدم قدم کا میلہ لگتا۔ بسنت کے موقع پر پاپا گڈی فروش کی چاندی ہوتی اور سارے علاقے کے پتنگ باز اس کو آرڈر دے کر پتنگیں، گپ، مچھر، گڈے، پریاں تیار کرواتے اور ڈوریں لگواتے۔

مسز بیگ کے سکول سے جب نادرہ نے پانچویں جماعت پاس کی تو اسے قرآن مجید کے پہلے پانچ سیپارے ازبر ہو چکے تھے اور انگریزی کا جو سلیبس ٹیکسٹ بک بورڈ کی طرف سے ساتویں جماعت کے لیے منظور تھا وہ سارے کا سارا پانچویں جماعت میں ہی پڑھ چکی تھی۔ نادرہ اور صوفیہ نے اسلامیہ گرلز ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ جو عظیم سٹریٹ میں ہی واقع تھا۔

ایک روز شہر میں ہنگامہ ہوا۔ لوگ سراسیمگی میں اپنی بچیوں کو لینے سکول پہنچ گئے۔ دادا جان نے نادرہ اور ناصر کو بھی گھر کے کمروں میں بند کر کے کنڈیاں چڑھالیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے۔ ''کیا ہوا بابا جان؟'' دادا بہت گھبرائے ہوتے تھے۔ شعیہ سنی فساد ہو گیا ہے۔ لوگ خنجر ہاتھ میں پکڑے کالے کپڑے پہننے والوں کو شہید کر رہے ہیں۔ ان کا اس آبادی میں شیعوں کا واحد گھر تھا۔ لٰہذا محلے کے کچھ اوباش نوجوانوں نے انکے گھر پر حملہ کرنے کا بھی ارادہ کر رکھا تھا اور اس انتظار میں تھے کہ فساد کی آگ پھیلے تو وہ اپنے ارادے پورے کریں۔

مگر حکومت نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا اور حالات مزید بگڑنے نہیں پائے۔ جمعرات کو نادرہ اور ناصر حضرت عباس علمدارؑ کے علَم پر دیوں میں تیل ڈالنے گئے تو وہاں علَم غائب تھا۔ صرف پانی کے دو مٹکے پڑے تھے جن پر اللہ اور محمد لکھا تھا۔ باقی چاروں مٹکے ٹوٹ کر کچھ سڑک پر اور کچھ نالی میں بکھرے پڑے تھے۔

''ہم سب مسلمان ہیں ناں...... ہم سب پاکستانی ہیں، پھر یہ ہنگامہ کیوں ہوا۔ شعیہ سنی آپس میں دشمن کیوں ہیں؟''

نادرہ کے ان سوالوں کا جواب نہ تو امی کے پاس تھا اور نہ ہی دادا کے پاس۔

وقت گذرتا گیا۔ عظیم سٹریٹ بہت بڑا کاروباری مرکز بن گیا۔ رام گلی کا نام بدل کر رحمان گلی رکھ دیا گیا۔

آج جب نادرہ کی شادی کو تیرہ برس بیت چکے ہیں۔ اس کا دس سالہ بیٹا اس سے پوچھ رہا ہے۔ ''ماما قادیانی کافر ہوتے ہیں ناں''

پاکستان کو بنے کتنے برس ہو چکے ہیں۔ کافروں سے ملک آزاد ہو چکا تھا۔ مسٹر بیگ نے اسے نماز سکھائی اور قرآن شریف کے پہلے پانچ سپارے زبانی یاد کروائے تھے۔ نادرہ سوچ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کو کیا جواب دے؟





پلکوں پہ آنسوؤں کا گذر تھا تو وہ ملا
نیلے سمندروں کا سفر تھا تو وہ ملا

صحرا کی ریت نے میرے پاؤں جکڑ لیے
میری مسافتوں کا اجر تھا تو وہ ملا

شب بھر نمازِ عشق پڑھی چشم تر کے ساتھ
میری ریاضتوں کا ثمر تھا تو وہ ملا

اس پیکرِ جمال کو سوچا تھا بارہا
میری صداقتوں کا اثر تھا تو وہ ملا

عشق نہ پُوچھے ذات

محبت......محبت......محبت
تمہیں اور کوئی کام نہیں
کتاب میں تصویر رکھنا اور آئینہ کے بہانے محبوب کو دیکھنا
رات کو تکیے کے نیچے رکھ کر باتیں کرنا اور تکیے سے لپٹ لپٹ کر سونا
یہ ساری لڑکیاں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں۔
سولہواں برس لگتے ہی جو سامنے آیا وہی ان کا محبوب بن گیا
چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔
خوبصورتی کا معیار کیا ہے
اس کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔
کبھی کوئی فرسٹ کزن محبوب کی زد میں آجاتا ہے
اور کبھی سامنے والی کھڑکی میں رہنے والا ہمسایہ۔
زونی کو نا جانے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا
اس کی تمام سہیلیاں اور فرسٹ کزن لڑکیاں کسی نا کسی محبوب کی دیوانی تھیں۔
چُھپ چُھپ کر دیکھنا، باتیں کرنا، اور کتاب میں تصویر رکھنا۔""

"یار یہ کیا ہے"...... یہ بندر تمہیں پسند ہے۔

زونی نے اپنی سہیلی نازو کو چھیڑا۔اس کا تو ناک چپٹا ہے!

اور یہ چھوٹی آنکھوں والا...... حمیرا تمہیں اس میں کیا دکھائی دیتا ہے۔

لڑکیاں اس کی باتوں کا بُرا نہیں مناتی تھیں

بس ہنس کر کہتیں جب تمہیں کوئی پسند آئے گا تو دیکھیں گے۔

وہ کون سے پرستان کا شہزادہ ہوگا؟

"ہاں وہ واقعی پرستان کا شہزادہ ہوگا...... گلفام!"

دراز قد، نشیلی آنکھیں، گھنگریالے بال، کشادہ سینہ، ستواں ناک، نہایت شاندار!

دیکھو گی تو دیکھتی رہ جاؤ گی...... زونی ہنس کر کہتی۔

مگر زونی کا شہزادہ کہاں تھا؟

اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ایک ایک کر کے سب لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں اور سب نے اپنے خوابوں کے شہزادوں کے گھر بسا کر اپنے من کی مرادیں پالیں۔

زونی اکیلی تھی...... اپنے آپ میں مگن...... اپنی خوبصورتی پر نازاں۔

اپنے گلفام کے انتظار میں......!

کئی لڑکوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی مگر اس نے نہایت حقارت سے انہیں ٹھکرا دیا۔

نجانے کیوں زونی کو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی نظر آتی۔

اس کے لیے کتنے ہی رشتے آئے۔کسی کا قد میانہ تھا، کسی کا رنگ سانولا تھا، کسی

کی آنکھیں چھوٹی تھیں،

کسی کا ناک چپٹا تھا، اور کوئی سر سے گنجا تھا۔

وہ سب کو ٹھکراتی رہی۔آخر کب تک اکیلی رہو گی؟

اس کی ماں اس کے لیے فکر مند تھی!

انسان تو انسان ہوتے ہیں۔خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ!

ان کو ان کی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ اپنانا پڑتا ہے۔اتنا زیادہ کریدنا نہیں چاہیے۔

اس دنیا میں کوئی ذات مکمل نہیں ہے۔مگر زونی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا

"ماں وہ ضرور آئے گا۔مجھے اس کا انتظار ہے!"

مجھے چاند کے چہرے میں اس کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔

وہ مجھے اپنے پاس بلاتا ہے ماں!

لیکن وہ بہت دور ہے! کسی اور دیس میں۔

"مجھے اس کے پاس جانا ہے"

"تو تو پگلی ہے۔یہ پاگل پن چھوڑ کر اپنا گھر بسا لے۔"

انسان کی اصل خوبصورتی اس کی اچھی عادتیں ہوتی ہیں۔جب کوئی تمہارا بہت سارا خیال رکھے

تمہیں بہت پیار کرے اور جس کے قریب تم خود کو زندگی کی ہر بلا سے محفوظ محسوس کرو۔

وہی سب سے حسین ہے۔

ماں اس کو سمجھاتی۔ مگر زونی اپنی ضد پر قائم تھی۔

''ماں ابھی تک کسی کو دیکھ کر میرا دل زور سے نہیں دھڑکا۔ کسی کو دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی خواہش من میں پیدا نہیں ہوئی۔ پھر میں کیسے کسی کو اپنا بنالوں''۔

''اچھا جو تمہاری مرضی۔ ماں کے ہاتھ تسبیح کے دانوں پر زور زور سے چلنے لگتے''۔

زندگی بڑی روانی سے رواں دواں تھی۔ یونیورسٹی ختم ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ زونی ایک انٹرنیشنل فرم میں افسری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ کئی طرح کے لوگ کام کرتے تھے۔

مصر کے تراشے ہوئے مجسموں جیسے خوبصورت لڑکے...... تیمور اور احمد...... ترکی کا نشیلی آنکھوں والا...... مصطفےٰ...... جرمنی کا سٹیفن...... اور اردن کے شہزادوں جیسی چال ڈھال والے...... مراد اور ماھر...... زونی کے لیے یہ سب بس اچھے کولیگ تھے اور کچھ نہیں۔ وہ ان کے ساتھ دفتر میں کام کرتی، کافی پیتی، حالات حاضرہ پر بحث کرتی اور گھر چلی آتی۔

ایک روز اس کے دفتر میں ایک سیمینار تھا۔ بہت سے ممالک کے لوگ اکٹھے تھے اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک کالے رنگ...... میانے قد...... چپکے ناک...... چھوٹی آنکھوں...... موٹے ہونٹ...... اور گنجے سر والا لڑکا بیٹھا تھا۔

زونی نے اسے دیکھ کر سوچا۔ یا اللہ تم نے ایسے بھی انسان بنائے ہیں۔

''اس لڑکے نے زونی کے قریب جھکتے ہوئے مسکرا کر کہا''۔

''میرا نام یوسف ہے''

''یوسف! زونی کے لیے ایک اور حیرت تھی''۔

اس کی ماں نے اس کا نام یوسف رکھا تھا۔ وہ اسے واقعی یوسف ثانی سمجھتی ہو گی۔

''جی بہت خوشی ہوئی آپ سے ملکر، زونی نے تکلفاً کہا اور دوسری طرف رخ کر لیا''۔

مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ اسے دیکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا اس نے پلٹ کر دیکھا یوسف اپنی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ گنجا سر، چھوٹی آنکھیں، کوئلے جیسی سیاہ رنگت، پچکا ناک اور نہایت موٹے بھدے ہونٹ۔

یوسف نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ زونی کو اس کے سیاہ چہرے پر اس کے چمکتے سفید دانت دکھائی دیے۔

اس بار یوسف کے چہرے اور آنکھوں میں ایک چمک اور تھی...... وہ ذہانت اور علم کی چمک تھی...... سیمینار کے دوران جب وہ بولتا تو سب لوگ غور سے اسکو سنتے اور اس کی باتوں میں سب محو ہو جاتے۔

زونی اس کو دیکھتی اور اس کے مسکرانے کا انتظار کرتی تا کہ اس کے سفید دانت اس کے سیاہ چہرے کو روشن کر دیں۔

سیمینار ختم ہو گیا۔ سب لوگ چلے گئے۔ زونی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اداس ہو گئی ہے۔

وہ کیوں اداس تھی؟ کس کے لیے اداس تھی؟ اس کو معلوم نہ تھا مگر کچھ تھا جو کھو گیا تھا۔ اس کو دفتر میں، گھر میں ہر جگہ کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ہر شے ادھوری تھی۔

ایک روز اس نے دفتر کی دراز کھولی تو ایک کارڈ پڑا تھا...... یوسف......!

یہ نام دیکھتے ہی جیسے اس کا دل زور سے دھڑکا......ایک بے نام سی خوشی اس کی رگوں میں دوڑ گئی......اور اس نے فوراً وہ کارڈ پکڑ کر اس پر لکھا ٹیلی فون نمبر ڈائل کر دیا۔

''Yes Please'' یوسف نے فون اٹھا کر کہا۔

گویا زونی کی قوت گویائی چھن گئی۔اور دل زور زور سے اچھلنے لگا۔

''کیا تم مجھے ملنے آسکتے ہو یوسف'' اس نے نہ جانے یہ کیسے کہہ دیا۔

ہاں زونی! پہلی فرصت میں آؤں گا۔

یوسف نے فون رکھ دیا......زونی انتظار کی گھڑیاں گننے لگی......محبت کیا ہے؟ کس سے کب ہو جائے کوئی نہیں جانتا۔لیکن محبت ایک خوشی ہے جو زندگی کو رواں دواں رکھتی ہے۔

زونی کی زندگی میں نئی روانی آ گئی تھی۔اس کی آنکھوں میں انتظار اور دل میں بے قراری تھی۔

یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اسے خبر نہ تھی......لیکن وہ اسے محبت سمجھنے کو تیار نہ تھی۔محبت کا تو ایک معیار ہوتا ہے نا۔

جو ایک گلفام شہزادے سے ہی کی جا سکتی ہے اور......یوسف......اس میں کوئی خوبی نہ تھی......بس اس کے چہرے پہ موتیوں جیسے چمکتے دانت۔پھر یوسف کے لیے اس کے دل میں اداسی کیوں تھی؟ اور اس کی آنکھوں میں انتظار کیوں تھا؟

یوسف اس سے ملنے آیا......غیروں کی طرح......کسی کام سے......زونی کا دل مچل اٹھا۔

تم اتنے غیر کیوں ہو یوسف؟ میں تو تمہیں بہت دنوں سے اپنے قریب اپنی سانسوں میں محسوس کر رہی ہوں۔اس نے اپنے دل میں کہا۔

لیکن وہ اس کے جذبات سے ناآشنا تھا۔لاپرواہ......لاتعلق۔

زونی کے دل کی تڑپ اور بڑھ گئی۔تم ایسے لاپرواہ کیسے ہو سکتے ہو۔اور اتنے لاتعلق بھی۔میں نے ساری زندگی تمہارا انتظار کیا ہے۔اور اب تم اجنبیوں کی طرح کیوں ملتے ہو!

زونی یہ سب سوچتی رہی مگر یوسف کے چہرے پر وہی اطمینان، وہی ہنسی اور وہی لاپرواہی ہوتی۔

زونی کا دل چاہتا یوسف ہر وقت اس کے قریب رہے۔

بارش میں، دھوپ میں، چاندنی راتوں میں اس کے قریب بیٹھے۔اس سے بہت سی باتیں کرے۔

مگر وہ اسے کچھ نہ کہہ سکتی۔وہ ہمیشہ کی طرح دور سے ہاتھ ہلا کر گزر جاتا۔اور وہ دیر تک اسے سوچتی رہتی۔

ایک صبح یوسف بہت خوش تھا۔اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا پیکٹ تھا۔کیا آج تم مجھے گلے لگاؤ گی؟

یوسف نے اس سے پوچھا اور اچانک اسے گلے لگا لیا۔

زونی کے لیے یہ سب حیران کن تھا۔

''آج میری سالگرہ ہے۔میں تیس برس کا ہو گیا ہوں''۔

''سالگرہ مبارک ہو'' زونی نے اس کے کان میں کہا۔اس سے الگ ہوتے

ہوئے نجانے کیسے زونی کے ہونٹ یوسف کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔

اس نے پہلی بار محبت کا ذائقہ چکھا......محبت جو اندھی ہوتی ہے......ذات پات سے بے نیاز۔

محبت کب ہو جائے......کس سے ہو جائے......کوئی نہیں جانتا......زونی سرتاپا محبت میں سرشار ہو چکی تھی۔

اس کے خوابوں کا شہزادہ......اس کا گلفام اس کو بازوؤں میں لیے کھڑا تھا۔اور اس سے جدا ہونا اب زونی کے بس میں نہ تھا۔



میں وقت سے آگے بھاگ رہی تھی

میں وقت سے آگے بھاگ رہی تھی
مجھ کو ڈر تھا
وقت سے پیچھے رہ جانے کا
گر جانے کا
کھو جانے کا
اک دم یہ احساس ہوا
وقت اور منزل دونوں میرے پیچھے ہیں
میں بھاگ رہی ہوں

اب منزل کو کیسے پاؤں؟
پیچھے کیسے جاؤں؟